قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1966

زندہ باد

ہندوستان کی لوک سبھا (پارلیمان) میں مسٹر کپور سنگھ نے یہ الزام لگایا کہ حالیہ جنگ کے دوران فاضلکا سیکٹر میں پاکستانی سپاہیوں نے ہندوستانی عورتوں کو اغوا کیا ہے۔ اس پر ہندوستان کے وزیر دفاع مسٹر چون نے کہا کہ انہوں نے کسی ایسے واقعہ کی خبر نہیں سنی لیکن وہ اس کے متعلق تحقیق کریں گے۔

اس تحقیق کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم مسٹر رام کشن نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا کہ:

پاکستانی سپاہیوں نے کسی عورت کو اغوا نہیں کیا

(پاکستان ٹائمز، ۲۸- نومبر ۱۹۶۵ء)

پاکستان کے قابلِ فخر سپاہیو! خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے اپنے حسن کردار سے ساری قوم کو دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔ ایک مسلمان سپاہی کا یہی شیوہ ہونا چاہئے۔ اور اسی میں تمہاری فتح کا راز ہے۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ

تین تازہ کتابیں

(۱) **اسلامی معاشرت** | جس کے تازہ ایڈیشن کا ایک مدت سے انتظار تھا ۔ اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں ۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے ۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ ۔ چیپ ایڈیشن ۔ قیمت دو روپے ۔

* * * * *

(۲) **مقام حدیث** | حدیث کا صحیح مقام کیا ہے ۔ حدیثوں کو کس نے جمع کیا ۔ یہ ہم تک کیسے پہنچیں ۔ احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے ۔ رسول اللہؐ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے ۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب میں اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی ۔ چیپ ایڈیشن ۔ قیمت چار روپے ۔

* * * * *

(۳) **بہار نو** | پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ ۔ اس میں بڑے اہم مضامین آ گئے ہیں ۔ حالات حاضرہ کے تقاضے ، تعلیم جدید سے اسلام کے خلاف پیدا ہونے والے اعتراضات ، ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی الجھنیں ۔ ان سب سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اور پرویز صاحب کا قلم ۔ اس سے آپ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ کر لیں ۔ چیپ ایڈیشن ۔ قیمت پانچ روپے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ ،
لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

بدل اشتراک

پاک و ہند سے

سالانہ ــــــ دس روپے

غیر ممالک سے

سالانہ ــــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون:- (۸۰۸۰۰)

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۲۵/بی - گلبرگ لاہور

جلد ۱۹ | جنوری، سنہ ۱۹۶۶ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

لمعات		۲
پاکستان اور دین اور سیاست	(محترم حنیف رامے - پرویز صاحب)	۱۱
دیکھا جو تیر ا نقش قدم	(صفدر سلیمی)	۴۲
پھر وہی ....؟		۵۳
پاکستان کی نئی "زیارت گاہیں"	(محترم پرویز صاحب)	۵۷
بچوں کا صفحہ		۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بعض اوقات سیاسی معاملات سے متعلق بحث وتمحیص کے سلسلہ میں ایسے امور کا تذکرہ بھی آجاتا ہے جن کا اثر دین کے بنیادی اصول پر ہوتا ہے۔ اس بحث وتمحیص میں چونکہ تمام تر توجہ سیاسی تقاضوں پر مرکوز ہوتی ہے اس لئے ان نکات کو جن کا دین کے اصولوں پر اثر پڑتا ہے محض ضمنی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ سیاسی ہنگامہ فرو ہو جاتا ہے تو ان (دین سے متعلق) نکات کا اثر غیر شعوری طور پر باقی رہ جاتا ہے اور اکثر اوقات بڑی گمراہی کا موجب بن جاتا ہے۔ چونکہ مسلمان کی زندگی میں دین کے اصول ومبادیات کو اولیت حاصل ہے اس لئے ہمارا شعار یہ ہونا چاہیئے کہ جن نکات کا اثر، بالواسطہ یا بلاواسطہ، دین کے اصولوں پر پڑتا ہو، وہ خواہ ضمناً اور تبعاً ہی زیر بحث کیوں نہ آئیں ان سے متعلق کبھی سرسری اور سطحی طور پر گفتگو نہ کی جائے بلکہ ان کی اہمیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔ آجکل ہمارے ہاں، سیاسی تقاضوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک ایسا نکتہ ضمناً درمیان میں لے آیا جاتا ہے جس کا تعلق دین کے بنیادی اصولوں سے ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں اس کا جائزہ لے کر دیکھ لیا جائے کہ اس کی صحیح پوزیشن کیا ہے ــــ کہا یہ جاتا ہے کہ جب کسی اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اور غیر اہل کتاب (منکرین خدا) کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کا سوال زیر غور ہو تو مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اہل کتاب کو غیر اہل کتاب پر ترجیح دیں کیونکہ اہل کتاب خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے کسی نہ کسی رسول پر ایمان رکھتے ہیں، کسی نہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ آخرت کی زندگی پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہ امتیاز وہ ہیں جو مسلمانوں میں اور ان میں مشترک ہیں اس لئے وہ غیر اہل کتاب کے مقابلہ میں بہرحال مسلمانوں سے قریب تر ہیں۔ لہٰذا سیاسی روابط میں قابل ترجیح ــــ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ

ہے جس کا رفع کیا جانا، ہمارے نزدیک بہت ضروری ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اہل کتاب، ان امور پہ ایمان رکھنے کے مدعی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم ان کے اس دعوے کو مبنی بر صداقت و حقیقت سمجھتا ہے اور ان کے اس ایمان کو کوئی اہمیت دیتا ہے؟ اس باب میں قرآن کریم کا جواب حتمی اور قطعی طور پر نفی میں ہے۔ وہ نہ اہلِ کتاب کے اس ایمان کو ایمان قرار دیتا ہے اور نہ ہی اپنی میزان میں اس کا کوئی وزن ٹھہراتا ہے۔ وہ انہیں بھی اسی طرح، خدا۔ رسل۔ کتب۔ ملائکہ۔ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جس طرح غیر اہل کتاب کو دعوت دیتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) سورۂ آل عمران میں جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اور تم خدا پر ایمان رکھتے ہو" اس کے بعد ہے وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۳/۱۱۰) اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آئیں تو ان کے لئے بہتر ہو۔

(۲) سورۃ المائدہ میں ہے۔ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا ..... (۵/۶۵)۔ اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو انہیں جنت میں داخل کر لیا جاتا۔

(۳) انہیں قرآن کریم پر ایمان لانے کی اسی طرح دعوت دی گئی جس طرح دوسرے انسان کو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا گیا وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ (۲/۴۱)۔ تم اس (کتاب) پہ ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے اور جو اس تعلیم کی مصدق ہے جو تمہیں دی گئی تھی اور سب سے پہلے تم ہی تو اس سے انکار نہ کرو۔ اور اس ایمان کی عملی تشریح ایک ہی آیت آگے جا کر ان الفاظ میں کی گئی کہ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲/۴۳)۔ تم اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دو اور (تو انین خداوندی کے سامنے) جھکنے والوں کے ساتھ مل کر جھکو۔ اسی دعوت کا اعادہ (۴/۱۳۶) میں کیا گیا ہے۔ سورۂ محمدؐ میں مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ (قرآن کریم) پر ایمان لانے کی دعوت (بلا تخصیص اہل کتاب و غیر اہل کتاب) ہر ایک کو دی گئی ہے۔ (۴۷/۲) اور سورۂ المائدہ (۵/۱۹) میں اہل کتاب کو خاص طور پر مخاطب کر کے، رسول اللہؐ پر ایمان لانے کے لئے کہا گیا ہے۔

(۴) سورۂ آل عمران میں ہے وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (۳/۱۹)۔ ان اہلِ کتاب اور غیر اہل کتاب سے کہو کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں۔ اگر یہ اسلام لے آئیں تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ

صحیح راستے پر آگئے ہیں - اور اگر یہ اس دعوت سے اعراض برتیں تو اے رسول ! تیرے ذمے اس دعوت کا ان تک پہنچا دینا ہے - (ماننا نہ ماننا ان کے اپنے اختیار کی بات ہے)-

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ اہل کتاب خدا- وحی - آخرت پر پہلے ہی ایمان رکھتے تھے (اور ایمان رکھتے ہیں)، تو ان سے ایمان کے مطالبہ سے کیا مقصد ہے ؟ بات صاف ہے - دنیا میں (چند دہریوں کے سوا) خدا پر ایمان کا مدعی ہر شخص ہے لیکن خدا کا تصور ہر ایک کا الگ الگ ہے - قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو خدا پر ایمان تسلیم نہیں کرتا - وہ اسی خدا پر ایمان کو صحیح ایمان باللہ تسلیم کرتا ہے جس خدا کا تصور قرآن کریم میں دیا گیا ہے - اس لئے کہ یہ تصور خود خدا کا دیا ہوا ہے اور اپنی حقیقی منزہ شکل میں وہیں موجود ہے - اس کے علاوہ، اس انداز کا صحیح تصور اور کہیں نہیں - یہ تصور اہل کتاب کو ان کے انبیاء نے اپنے اپنے وقت میں دیا تھا لیکن اب ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنے نبی کی تعلیم اس کی حقیقی شکل میں موجود نہیں - اس میں انسانی خیالات اور تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے - اس لئے خدا کا خالص، منزہ تصور ان کے ہاں نہیں مل سکتا - یہی کیفیت وحی - ملائکہ - آخرت کے تصورات کی ہے - یہ تصورات بھی اب قرآن کریم ہی کے اندر مل سکتے ہیں - یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے جماعت مومنین سے کہا کہ تم واضح الفاظ میں بتا دو کہ ہم اس طرح ایمان لاتے ہیں - اور اس کے بعد کہا کہ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ (۲/۱۳۷)

پھر اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لاتے ہو تو یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے - اور اگر یہ اس نہج سے ایمان لانے سے اعراض برتیں تو پھر یہ مخالف راستے پر جا رہے ہیں-

اس سے بات واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کی رو سے، خدا کو ماننے والے انہی لوگوں کو سمجھا جائے گا جو اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح قرآن نے بتایا ہے - جو اس طرح ایمان نہ لائیں، وہ اپنے آپ کو کتنا ہی خدا پرست کیوں نہ کہیں، قرآن کی میزان میں ان کے اس دعوے کا کوئی وزن نہیں ہوگا - یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم دنیا میں دو ہی جماعتوں کو تسلیم کرتا ہے — ماننے والے (مومن) اور نہ ماننے والے (کافر)-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۚ (۶۴/۲)

خدا نے تمہیں پیدا کیا - سو تم میں سے بعض کافر ہیں - اور بعض مومن-

جو قرآنی معیار کے مطابق مومن نہیں، وہ کافر ہے، خواہ اس کا شمار اہل کتاب میں ہو، خواہ غیر اہل کتاب میں - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خود اہل کتاب کو بھی کافر کہہ کر پکارا ہے — مثلاً الَّذِينَ كَفَرُوا

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۹۸ : ۶) - اور انہیں اور مشرکین کو ایک ہی زمرے میں رکھا ہے - (۹۸/۶) - حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ دونوں کو (خدا کے متعلق ان کے باطل عقائد کی بنا پر) مشرک کہا ہے - (۹/۳۱) -

یہاں تک تو بات صرف ایمان تک محدود تھی - قرآن کریم ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴) - جو لوگ بھی قرآن کریم کے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے نہیں کرتے - وہ کافر ہیں - ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا - دیکھئے، وہ اہل کتاب کے متعلق کیا کہتا ہے - سورۂ توبہ میں ہے -

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... (۹/۲۹) -

اہل کتاب سے بھی جنگ کرو[1] جن کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر - نہ ان امور کو حرام قرار دیتے ہیں (یا واجب ٹھیراتے ہیں) جنہیں خدا اور اس کا رسول حرام قرار دیتے (یا واجب ٹھیراتے ہیں) - نہ اس حق و صداقت پر مبنی دین کی اطاعت اختیار کرتے ہیں ......

اور جماعت مومنین سے کہا گیا کہ اگر تم نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تو یہ تمہیں، ایمان لے آنے کے بعد، پھر کفر کی طرف لوٹا دیں گے - (۳/۹۹) -

قرآن کریم نے باہمی تعلقات کی دو قسمیں بتائی ہیں - ایک ولایت کے تعلقات اور دوسرے معاہدات کی رو سے تعلقات - پہلی قسم کے تعلقات (جنہیں یک قلبی کی دوستداری کے تعلقات کہنا چاہیئے) غیر مسلموں سے نہیں ہو سکتے - ان کے لئے قرآن کریم نے، اہل کتاب اور غیر اہل کتاب میں کوئی تخصیص و تفریق نہیں کی - چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵/۵۱)

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوستدار مت بناؤ - یہ ایک دوسرے کے

---

[1] اس سے یہ مراد نہیں کہ ان سے محض اس لئے جنگ کرو کہ یہ اس طرح ایمان نہیں لاتے - کسی قوم سے جنگ کرنے کی جو شرائط قرآن کریم نے مقرر کی ہیں، ان شرائط اور حدود کے مطابق، عند الضرورت جنگ کرو - اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم، اہل کتاب کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔

دوست ہیں - سو تم میں سے جو بھی ان کے ساتھ دوستداری کے تعلقات وابستہ کرے گا تو اس کا شمار انہی میں سے ہوگا۔

اس لئے کہ

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۶۱/۹)

یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ لیکن خدا ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا خواہ یہ بات ان کافروں کو کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

قرآن کریم میں یہ الفاظ دو مقامات پر آئے ہیں (دوسری جگہ ۶۱/۹ میں ہیں) اور دونوں جگہ یہ یہود و نصاریٰ ہی کے سلسلہ میں کہے گئے ہیں اور ان کے بعد دونوں جگہ کہا گیا ہے کہ "خدا نے اپنے رسول کو الھدیٰ اور دین الحق دے کر بھیجا ہے تاکہ یہ دین، تمام دیگر نظامہائے حیات پر غالب آئے۔ خواہ یہ بات مشرکین کو کیسی ہی بری کیوں نہ لگے"

نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ نے جس طرح کفار اور مشرکین سے لڑائیاں لڑیں، اسی طرح اہل کتاب سے بھی لڑیں۔ اور جس طرح ان سے معاہدات کئے اسی طرح ان سے بھی کئے - چنانچہ یہودیوں کے خلاف جنگ کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے۔ (۹/۲۹ ؛ ۳۳/۲۶)۔ اور سورۂ حشر کی تو ابتدا ہی اسی تذکرہ سے ہوتی ہے۔ یہ یہودیوں کے ساتھ جنگ تھی - اور اس کے بعد عیسائیوں کی عظیم سلطنت، بازنطین کے خلاف پہلی مہم، خود رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں ہوئی اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں اسے فتح ہی کر لیا گیا۔ صلیبی جنگوں میں پوری دنیائے عیسائیت مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما تھی۔ اور ان جنگوں کا سلسلہ، سال دو سال نہیں، سینکڑوں برس تک مسلسل جاری رہا۔ اب بھی یہ "خدا پرست" قومیں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہی ہیں وہ ظاہر ہے

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم نے اہل کتاب اور غیر اہل کتاب (کفار اور مشرکین) میں کوئی تخصیص نہیں کی، حتیٰ کہ اہل کتاب کے ایمان باللہ کو بھی ایمان تسلیم نہیں کیا۔ اس کی رو سے دونوں کا شمار ایک ہی زمرہ میں ہوتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ میں مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہود، عداوت میں زیادہ شدید ہیں اور نصاریٰ تعلقات میں قریب تر، کیونکہ ان کے راہبوں میں تکبر نہیں۔ (۵/۸۲)۔

البتہ ایک مقام ایسا ہے جہاں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب میں تفریق کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل کتاب کا کھانا، اور ان کی پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا مسلمانوں کے لئے جائز ہے - ہم اس مقام پر اس بحث

ہیں نہیں جانا چاہیئے کہ یہ اجازت کن شرائط کے ماتحت ہے اور جب خلافت راشدہ کے زمانہ میں سیاسی حالات کا تقاضا ہوا تو اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کو بھی کس طرح روک لیا گیا۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، اہلِ کتاب اور دیگر عام کفار و مشرکین میں صرف ان باتوں میں تفریق کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان معاشرتی معاملات میں تخصیص کا اثر کسی طرح بھی سیاسی روابط پر بھی نہیں پڑ سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ جب سیاسی تعلقات کے سلسلہ میں، اہلِ کتاب اور منکرین خدا میں تقابل ہو، تو اہلِ کتاب کو محض اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے ترجیح دی جائے گی۔ یہ دونوں ایک ہی صف میں ہوں گے۔ ان سے تعلقات معاہدہ کی رو سے قائم کئے جائیں گے۔ اور معاہدہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ ہماری مملکت کا فائدہ کس بات میں ہے اور معاہدہ کسی طرح اسلام کے نظریات اور تعلیمات پر مضر اثر نہیں ڈالتا۔ ان امور سے متعلق اطمینان کر لینے کے بعد، ہمیں اجازت ہے کہ ہم دنیا کی کسی قوم سے بھی معاہدہ کر لیں۔ اس میں (BELIEVERS IN GOD) اور (NON-BELIEVERS) کی کوئی تخصیص نہیں۔ (خود حضورؐ نے مشرکین مکہ سے معاہدہ حدیبیہ کیا تھا)۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے اس باب میں صحیح پوزیشن۔ لہٰذا، ہمیں ان عناصر کی طرف سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیئے جو سیاسی مقاصد کی خاطر دین کو غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔

۲۔ تعاون کی قیمت

اس حقیقت سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں کہ پاکستان کا حصول و قیام کروڑوں مسلمانوں کے لئے تقاضائے دین و ایمان اور عالم اسلام کی امیدوں کے مرکز و محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر پاکستان کے خلاف بھارت کا جارحانہ اقدام نہ صرف اسلامیانِ پاکستان کے مقدس عزائم اور غیرت ایمانی کے لئے ایک کھلا چیلنج بلکہ عالم اسلام کی شہ رگ کو کاٹ ڈالنے کی ناپاک جسارت کے مترادف تھا۔ بنا بریں اپنی اس متاع دین و ایمان کے تحفظ کے لئے ملتِ پاک کے ہر فرد اور ہر عنصر نے ہر ممکن ایثار و قربانی کا ثبوت دیا۔ ہمارے مجاہدین صف شکن نے سرد و گرم کی بازیاں لگائیں اور عوام اپنی محبوب مملکت کے دفاع کے لئے تن من اور دھن سے برابر دشمن کے مقابل دست بہ پیکار رہے۔ صدر مملکت سے لے کر پاکستان کے عام شہری تک سب نے اپنا فریضہ ادا کیا اور دشمن کے ناپاک منصوبوں کو ناکام بنا کر رکھ دیا۔ حزب اقتدار ہو یا حزب اختلاف ملکی دفاع سب کی مقدس ذمہ داری تھی۔ کسی ایک کا کسی دوسرے پر کوئی احسان قطعاً نہ تھا۔ اور اگر آج کوئی اس

فریضۂ ملی کی ادائیگی کو بطور احسان جتلانے کی کوشش کرے اور صورت حال کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی قیمت وصول کرنے کا مدعی ہو تو اس کا یہ دعویٰ نہ صرف انتہائی شرمناک اور خود غرضی و بد باطنی پر مبنی قرار پائے گا بلکہ ہر غیور پاکستانی کی طرف سے مذمت اور ملامت کا مستحق بھی۔

لیکن ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ جنگ کے دوران میں جب پوری قوم دشمن کے مقابل سینہ سپر تھی تو حزب مخالف کے بعض عناصر نے بھی قومی دفاع میں حکومت سے تعاون کا اظہار کیا۔ یہ اظہار تعاون کوئی ڈھکا کارنامہ نہیں تھا بلکہ پوری قوم کو وقف پیکار پاکر حکومت کے یہ مخالف عنصر بھی اخلاقی طور پر مجبور تھے کہ قوم کا ساتھ دیں۔ اور انہوں نے جس قدر ساتھ دیا وہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ لیکن اب اس حزب مخالف کے بعض پرانے شکاری "متحدہ محاذ" کے نام سے پھر اپنے بوسیدہ جال لے کر عوام کے سامنے آئے ہیں اس وقت جبکہ صورت حال ابھی برابر ہنگاموں سے دوچار ہے اور جنگ بندی کے بے مقصد فیصلے غیر موثر ثابت ہو رہے ہیں کوئی سچا پاکستانی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ ان ہنگامی حالات میں دشمن کے مقابل منظم، متحد اور ہم آہنگ رہنے کی بجائے ایسی روش اختیار کر لی جائے جو ملک میں ذہنی انتشار پھیلانے اور عوام کو کار فرمایان مملکت سے جو دفاع کی نازک ذمہ داریاں کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں بدظن کرنے کا باعث ہو۔ لیکن اسے ملک و ملت کی بدنصیبی سمجھئے کہ اندرون پاکستان ایسے رجحانات اب پھر سر اٹھا رہے ہیں اور ایسی آوازیں اب پھر سنائی دے رہی ہیں جن کا مقصد ہوس اقتدار کے دبے ہوئے شعلوں کو ہوا دینے کے سوا کچھ نہیں۔ عوام کا فریضہ ہے کہ قومی وحدت اور ملکی استحاد کے خلاف ان کوششوں پر کڑی نگاہ رکھیں اور اپنے جذبات و احساسات کو ان کی شر انگیزیوں سے متاثر نہ ہونے دیں۔

متحدہ محاذ کے ان بزرگوں نے (جن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، چوہدری محمد علی، سردار شوکت حیات نوابزادہ نصر اللہ خاں وغیرہم سرفہرست ہیں) ۲ر دسمبر کی ایک پریس کانفرنس میں اس نازک مرحلے پر ملکی مسائل کے بارے میں جو مطالبات قوم کے سامنے پیش کئے ہیں وہ غور طلب ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

۱۔ یہ مسائل اپنے حل کے لئے ایک پرعزم اور دور اندیش قیادت کے متقاضی ہیں۔

۲۔ چونکہ معاملہ دس کروڑ اہل پاکستان کی قسمت کا ہے اس لئے کسی فرد واحد یا افراد کے کسی گروہ کو پاکستان کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالنے والے ایسے دور رس فیصلوں کی ذمہ داری تنہا اپنے کندھوں پر نہیں اٹھانی چاہیئے۔

۳۔ حکومت پاکستان اعلان کرے کہ آئندہ نمائندہ اداروں بشمول قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست ہوں گے۔ (المنبر ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۵ء۔ صفحہ ۳)

غور فرمایا آپ نے ان قیمتی مطالبات پر جو قوم کے نمائندہ بن کر ہنگامی حالات میں پیش کئے جا رہے ہیں کیا یہ وہی مطالبات نہیں جو گذشتہ عام ملکی اور صدارتی انتخابات کے موقع پر انہی بزرگو کی طرف سے پیش کئے گئے تھے؟ اور کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ ان مطالبات کے مقابل عوام اور ان کے نمائندوں نے صدر ایوب کو کامیاب بنا کر اپنا فیصلہ ... در کر دیا تھا؟ کیا پوری قوم کا یہ فیصلہ جس کی رو سے اس نے حزب مخالفت کے ان مطالبات کو مسترد کر دیا تھا، اس قابل نہیں تھا کہ یہ محروم اقتدار اس سے عبرت حاصل کرتے اور کم از کم ہنگامی حالات میں اس قسم کی شر انگیز طالع آزمائیوں سے باز رہتے؟ کیا یہ روش اس حقیقت کا اعلان نہیں کر رہی کہ جنگ کے دوران ان کا اظہار تعاون محض ایک مجبوری کا نتیجہ تھا۔ اس میں دل کا خلوص ہرگز شامل نہ تھا؟

اور آگے بڑھیئے! معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ دلوں میں جو زہر بھرا ہوا ہے وہ ذرا سی مہلت پاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہا ہے اور اس زہر چکانی کے عالم میں قطعاً اس پر دیانتداری سے غور نہیں کیا جاتا کہ ملک کہاں کھڑا ہے۔ اسے کن آزمائشوں کا سامنا ہے۔ ہمارے خارجی دشمن کن تیاریوں میں لگے ہیں۔

جماعت اسلامی کے نفس ناطقہ ناظم نشر و اشاعت، نعیم صدیقی صاحب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انہیں ۵ دسمبر کو وائی۔ ایم سی۔ اے ہال میں حسین شہید سہروردی مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس جلسے میں انہوں نے سہروردی مرحوم کی تعریف و توصیف کے پردے میں جو کچھ فرمایا وہ اسی جماعت کے ہفت روزہ آرگن "ایشیا" لاہور کی ۲۲ دسمبر کی اشاعت میں "لاہور کی ڈائری" کے عنوان سے صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ فرمائیے۔

> محترم نعیم صاحب نے فرمایا۔ "سہروردی مرحوم کا نام آتے ہی جمہوریت کی اس پیاس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے جو ہم میں سے ہر شخص ہر وقت محسوس کرتا ہے اور جس کا احساس موجودہ حالات میں پہلے سے بھی بڑھ گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت سہروردی زندہ ہوتے، تو وہ عوام کی بیداری، ان کے ایثار اور ان کے بے پناہ جذبے کو دیکھ کر جھوم اٹھتے۔ ان کی روح وجد میں آجاتی اور وہ اپنے بازوؤں میں پہلے سے کئی گنا زیادہ قوت محسوس کرتے۔ ان ایسا کوئی شخص ہوتا تو وہ بادشاہی کے تخت سے نیچے اتر کر عوام کو گلے لگاتا اور اس کی قوت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔
>
> جناب نعیم صاحب کے اس فقرے پر حاضرین نے بے اختیار تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔ نعیم صاحب نے مزید فرمایا کہ عوام کے اس جذبے اور ایثار کے بعد کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ جاہل ہیں۔ انہیں اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں اور وہ اپنے معاملات خود نہیں چلا سکتے۔

انہوں نے کہا - سہروردی ایسا کوئی آدمی ہوتا تو وہ اس حزب اختلاف کو جس نے غیر مشروط تعاون اور حمایت پیش کی ہے اور جس کی مثال دنیا کے باشعور ملکوں میں بھی نہیں ملتی، اپنے لئے عظیم سرمایہ سمجھتا - وہ حزب اختلاف کے رہنماؤں کو اپنے دل کی بات بتاتا اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتا، لیکن .....

سہروردی مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے محترم نعیم صاحب نے بین الاقوامی حکمت عملی کے میدان میں انکی مہارت کا بالخصوص تذکرہ کیا - انہوں نے فرمایا کہ سرحدوں کے محاذ پر جو جنگ ہم نے جیتی ہے اس سے کہیں زیادہ سخت جنگ ہمیں بین الاقوامی محاذ پر درپیش ہے - جہاں دنیا کے قمار خانے میں بڑے بڑے قمار باز حق وصداقت کی بنیاد پر فیصلے کرنے کی بجائے اپنے مفادات کی قربان گاہ پر قوموں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں - اگر سہروردی زندہ ہوتے تو وہ اس محاذ پر بڑی کامیابی سے لڑائی لڑ سکتے تھے - ان میں یہ صلاحیت تھی کہ دنیا کے کونے کونے سے اپنے حق میں تائید حاصل کرتے اور اگر وہ کسی پہلو سے اپنے اندر کوئی کمزوری بھی محسوس کرتے تو ان کے لہجے، الفاظ اور رویہ سے اس کا اظہار قطعاً نہ ہوتا بلکہ وہ پوری قوت سے اپنا موقف پیش کر کے اس کے لئے ڈٹ جاتے -

ایک ایک لفظ پر غور فرمایئے؛ سہروردی مرحوم کی تعریف وتحسین کے پردے میں دراصل کہا کیا جا رہا ہے اور ایک ایک نقرے کی زد کہاں پڑ رہی ہے، اسے سمجھنا مشکل نہیں - قارئین سمجھتے ہوں گے کہ جماعت اسلامی کے ان بزرگوں کے دلوں میں واقعی سہروردی مرحوم کی اسی قدر، قدر اور احترام موجود ہے جو سطور بالا میں سامنے آتا ہے - اور جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ واقعی ان کے دل کی آواز ہے - لیکن ایسا نہیں - جماعت اسلامی کے یہی بزرگانِ محترم حسین شہید سہروردی مرحوم کی زندگی میں ان کے خلاف جو کچھ کہتے اور لکھتے رہے وہ ابھی تک دنیا کو بھولا نہیں اور ان کے جماعتی اخبارات کی فائلیں اس کی شہادت دیتی ہیں - سہروردی مرحوم کی وزارت عظمیٰ کے دوران تو بالخصوص انہوں نے مرحوم کے خلاف جو کیچڑ اچھالا اور جو الزام بازیاں کیں وہ اس جماعت کے دفتر عمل سے دھویا نہیں جا سکتا - سوال پیدا ہوگا، کہ پھر مرنے کے بعد سہروردی مرحوم کیوں اقامتِ دین کے ان اجارہ داروں کے نزدیک اس قدر جامع الصفات قرار پا گئے - اصل نقطہ یہ نہیں کہ اب انہیں سہروردی مرحوم کی شخصیت میں واقعی کوئی خوبیاں نظر آنے لگی ہیں (ان کے نزدیک ان کی جماعت سے باہر کا کوئی انسان بھی کسی خوبی کا حامل نہیں سمجھا جاتا) - یہ سب کچھ مرنے والے کی عظمت کو خراج تحسین نہیں بلکہ اس خراج تحسین کے پردے میں ان کے نشتر کی زد کسی دوسرے پر پڑ رہی ہے - جب سہروردی مرحوم زندہ اور برسرِ اقتدار تھے تو وہ ان کے تیروں کا نشانہ بنتے رہے - اور مرنے کے بعد ان کی عظمت پر تو تحسین وآفریں کے پھول چڑھائے جانے لگے - لیکن جو ان کے بعد برسرِ اقتدار آئے اور آج ملکی دفاع اور تحفظ کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اب وہ ان کے تیروں کا نشانہ بن رہے ہیں - ان کے بعد ان کی یہی زد نئے

(باقی صفحہ ۳۰ پر دیکھئے)

پاکستان اور دین اور سیاست

ہفت روزہ نصرت (لاہور) کے مدیر حنیف رامے صاحب نے پرویز صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ انہوں نے اس روئیداد کی ایک کاپی ہمیں بھی مرحمت فرمادی ہے جسے ہم ان کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

حنیف ۔ اگر کسی کو یہ یادگار نعرہ بھول نہیں گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا: "لا الٰہ الا اللہ" تو وہ شاید انکار نہ کرے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا۔ لیکن پچھلے سترہ سال میں کئی مرتبہ یہ کوشش ہوئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جائے۔ کبھی کسی بڑے مصنف نے حکم لگایا کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا۔ ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ کبھی کسی بڑے وکیل نے ثبوت مہیا کیا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ مسلمانوں کے متعدد فرقوں میں اسلامی قوانین کے تعین پر شدید اختلاف پایا جاتا ہے، جو ایک کے نزدیک معروف ہے وہ دوسرے کے لئے منکر ہے۔ اس طرح ہم میں اندر ہی اندر ایک منافقت پرورش پاتی رہی جس کے تحت ہم نہ تو اسلام کا نام لینا چھوڑ سکے اور نہ ہم نے اس کی روشنی میں اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی راہیں تراشنے کی سبیل کی۔ پھر ایک دن آیا کہ ملک کے نام سے اسلامیہ کا لفظ اڑ گیا۔ منافقانہ اسلامیت

یہ علانیہ غیر اسلامیت بنتر تھی۔ لیکن جن عوام کو ساتھ ملانے کے لئے خواص نے ایک مرتبہ اسلام کا نام لیا تھا وہ ابھی اس دلفریب کو نہ بھولے تھے بلکہ برسوں کی سیاسی بیوست، معاشرتی ہلچل اور معاشی استحصال کو وہ اسی امید پر برداشت کرتے آئے تھے کہ کبھی تو اس مملکت خداداد پر اس قانون کی حکومت کے دن آئیں گے جس کا اسوہ نبی کریمؐ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے ضد کی اور اسلامیہ کا لفظ اس ملک کے نام میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

اب پچھلے دنوں ہم نے ایک انقلاب آتے دیکھا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ایک طرف تو آفاق پر دشمن کی یلغار تھی اور دوسری جانب انفس میں خدا جاگ رہا تھا۔ وہ خدا جو نیٹشے کے الفاظ میں مر چکا تھا، ہمارے دل و دماغ کے گردبادوں سے ابھر کر اس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آیا کہ ہم نے اور ہمارے لشکروں نے باقاعدہ خدائے ذوالجلال کے زیر کمان اپنے عنیم سے ٹکر لی اور جرأت و جواں مردی کے تازہ و تابندہ باب لکھے۔

آج یہ حالت ہے کہ ہمارے اندھوں کو بھی انسانی معاملات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین آچکا ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت ایک لمحے کو خواب و خرگوش سے بیدار ہونے والی قوم ایک مرتبہ پھر چونک کر کروٹ بدل چکی ہے۔ اگر ہم نے اس لمحۂ بصیرت کو پہلے کی طرح ضائع کر دیا تو یہ اپنے ساتھ ظلم ہوگا۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اِس در پہ اور اُس در پہ اور کبھی اِس چیز کی اور کبھی اُس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، بہ وسعت معانی، اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لئے خدا کی وحدت آفریں رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہمکنار رکھتی ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرنِ اول میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لئے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہو گئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے

بالفاظِ صریح شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لئے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لئے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین اربابِ حکومت کے سپرد کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) اربابِ مذہب کی تفویض میں دیدیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات) کے فیصلے کر لیا کریں۔ اس سے اربابِ حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور اربابِ مذہب بھی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (Secular FORM) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بجنسہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامتِ دین قرار دیدیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لئے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلامی) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عاید کر دیئے گئے ہیں۔ ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابلِ فہم ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کی باتیں قوم کے دانشمند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے (۱۹۳۰ء میں) پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

> مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائیگی جو توازن کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آجائے گا جس سے وہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر بزورِ ثبت لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو

پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرمؐ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سر نو زندگی اور حرکت عطا کی جا سکے۔ سطح بین نگاہوں اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لئے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خار و اراوادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی۔ سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نبی آجایا کرتا تھا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دین خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختم نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو جس میں دین خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظام حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیات اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لئے اگر خدا کی اس کتاب عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو امت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہد نبی اکرمؐ میں وجہ سرفرازی انسانیت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لئے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لئے ہوئے اٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ

حسبنا کتاب اللہ - ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی تھا وہ اجمال جس کی تفصیل قائد اعظمؒ نے (۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں) ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارے کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست

ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرسکتے ہیں۔ اسلامی
حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے...... اس
عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب سے متعلق ہدایات
موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی غرضیکہ
کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔"

قرآن کریم کی تعلیم کا انداز یہ ہے کہ اس میں ماسوا چند احکام کے جن کا تعلق بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے ہے، زندگی کے مختلف تقاضوں کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں اور امت مسلمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ امور کے لئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جائیں گے۔ اس طرح اس اُمت کا نظام خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کا دامن پکڑے ہوئے نہ صرف زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہوا بلکہ ان کی امامت کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اپنے مخصوص بلیغ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس
ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔
جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہوگا اس کے
لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق
و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی
زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں...... لیکن اگر
ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر
تغیر کا امکان ہی نہیں...... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک
واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔"

قرآن کریم کا یہ انداز اس طریق کے عین مطابق ہے جسے آجکل سائنٹیفک طریق کہا جاتا ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سائنسٹ تجرباتی طریق سے قوانین مرتب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ سائنسٹ قوانین فطرت مرتب نہیں کرتے، فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے ہیں۔ ان قوانین کے متعلق، جنہیں اساسی قوانین (Axioms) کہا جاتا ہے سائنسٹ یہ بتا ہی نہیں سکتے کہ وہ کس طرح دریافت ہوئے تھے۔

سائنس ان قوانین کو بطور حقیقت ثابتہ تسلیم کر کے انہیں اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتی ہے اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش آمدہ حالات پر منطبق کرتی ہے۔ سائنس کا تعلق خارجی کائنات سے ہے اور دین کا تعلق انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے۔ جن قوانین کو سائنس کی دنیا میں (Axioms) کہا جاتا ہے دین کے نظام میں وہ مستقل اقدار یا وحی کے عطا کردہ اساسی اصول کہلاتے ہیں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ یہ تھا اسلام کا وہ بنیادی تصور جس نے عملی پیکر عطا کرنے کے لئے پاکستان وجود میں لایا گیا تھا۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے میری یہی کوشش رہی کہ مملکت کے دستور میں یہ شق رکھی جائے کہ مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کو تسلیم کر لینے سے ایک طرف حکومت کا سیکولر انداز بھی ختم ہو جاتا تھا اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کا وہ اقتدار بھی باقی نہ رہتا تھا جو اسے شخصی قوانین کے دائرے میں اس وقت حاصل ہے۔ اس لئے میری دعوت کی مخالفت دونوں طرف سے ہوئی۔ سیکولر نظام کے حامی تو کھل کر سامنے نہیں آسکتے تھے لیکن مذہبی پیشوائیت کے لئے میدان وسیع تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے یہ تو نہیں کہا (نہ ہی وہ ایسا کہنے کی جرأت اپنے اندر پاتے تھے) کہ قرآن کی آمد سے ان کی گدی ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے عوام کے نازک جذبات کا سہارا لے کر یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ انکار سنت ہے۔ یہ (معاذ اللہ) انکار رسالت ہے۔ میں اس مقام پر اقرار و انکار سنت کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ وہ ہمارے پیش نظر موضوع سے متعلق نہیں، لیکن اتنی بات تو حنیف صاحب! بادنیٰ تدبر واضح ہو جائے گی کہ ان حضرات کے نزدیک اسلام کا یہی نقشہ تھا کہ مملکت میں پبلک لاز الگ ہوں اور پرسنل لاز الگ۔ پبلک لاز حکومت کے زیر اقتدار ہوں اور پرسنل لاز مذہب کے دائرے میں ——— اور پھر پرسنل لاز میں ہر فرقے کا مسلک الگ الگ ہو اور اس طرح امت کے تفرقے کو مستقل سند حاصل رہے۔ اسلام کا یہ نقشہ ان حضرات کے نزدیک عین مطابق سنت ہے۔ اور یہ نقشہ کہ قوانین میں کسی قسم کی تفریق نہ ہو، سب کا سرچشمہ خدا کی کتاب ہو اور یہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں منطبق ہوں تاکہ امت کا تفرقہ اور انتشار ختم ہو کر اس میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے ان کے نزدیک خلاف سنت ہے اور اس کا نام انکار رسالت ہے۔ فرمائیے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے!

بہر حال ان مخالفتوں کے علی الرغم میں نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ ہمارے ہاں یہ اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قوانین کی بنیاد قرآن کریم پہ ہوگی جو تمام فرقوں کے مسلمانوں میں قدر مشترک ہے۔ جب سنہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی ترتیب کا سوال زیر غور تھا تو حکومت کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری

کیا گیا تھا۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں اس بنیادی نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس اصول پر خاص زور دیا تھا۔ لیکن جب آئین مرتب ہو کر سامنے آیا تو اس میں "قرآن" کی بجائے "اسلام" کا لفظ لکھا تھا۔ تھیاکریسی کے حامیوں نے اسے بعد میں "کتاب وسنت" کے الفاظ سے بدلوالیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔

جس منافقت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ سیکولر نظام حکومت کے حامی دل میں اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ "اسلام" ہو یا "کتاب وسنت" اس سے قیامت تک کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور سے ہو سکے۔ (اس لئے کہ "اسلام" کی طرح "سنت" کا مفہوم بھی ہر فرقے میں الگ الگ ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ اتباع سنت کے مدعی حضرات آج تک یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا مطابق سنت ہے یا خفی آواز سے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ اس مسلک کی رو سے کبھی یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکے جو ان تمام حضرات کے نزدیک یکساں طور پر قابل تسلیم ہو؟) لہٰذا یہ طبقہ مطمئن ہے کہ نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے نہ مملکت اسلامی بنے گی۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ اس طرح ایسا ضابطۂ قوانین تاحشر مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک "اسلامی" کہلا سکے۔ اس لئے ان کی فرقہ بندی اور پرسنل لاز کے دائرے میں ان کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس سے دونوں گروہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن سیکولر انداز کا حامی گروہ یہ کہہ چھوڑتا ہے کہ فرقوں کا اختلاف قانون سازی کی راہ میں حائل ہے۔ اور مذہبی پیشوائیت یہ طعنہ دے چھوڑتی ہے کہ ارباب حکومت چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اور "اسلامی قوانین" سے ان کی مراد ہوتی ہے شراب، جوئے، ربیں اور زنا کی ممانعت یا عورتوں کی بے حجابی یا مردوں کے کلب اور جیم خانے وغیرہ پر بندش۔ یعنی وہ اخلاقی برائیاں جن کے بارے میں ان کے تمام فرقے متفق ہیں۔ لیکن جن امور میں ان حضرات میں باہمی اختلاف ہے ان کا ذکر کبھی نہیں آئے گا۔ ان سے پوچھئے کہ یہ اخلاقی برائیاں قرآن کریم کی رو سے جرائم ہیں لیکن فرقہ بندی، اس کی نص صریح کے مطابق شرک ہے، آپ جرائم کی روک تھام کے لئے قانون سازی پر تو اسقدر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس شرک کو ختم کرنے کے لئے آپ کی طرف سے کبھی اشارہ تک نہیں ہوتا بلکہ اگر حکومت کی طرف سے اس کے لئے کوئی کوشش ہوتی ہے تو آپ حضرات اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کوشش کو ناکام بنائے بغیر چین نہیں لیتے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء کے آئین میں پرسنل لاز کے متعلق مختلف فرقوں کے الگ الگ قوانین کے تصور کو ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور انہوں نے آئین کی اس شق کو بدلوا کر، اس کی جگہ فرقہ وارانہ تعمیر کی شق داخل کرا لی۔

گزشتہ ستمبر کے قیامت خیز ہنگامے میں ہماری قوم کے دل میں جو بے پناہ جذبہ بیدار ہوا ہے اور اس نے جو

محیر العقول کارنامے کو دکھاتے ہیں۔ وہ نتیجہ میں اسلام کے ساتھ اس گہرے لگاؤ کا جو ہمارے عوام کے تحت الشعور میں خوابیدہ چلا آرہا ہے اور جو اس قسم کے تصادمات کے وقت یک دم بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ متاع بیش بہا ہے اور اسے عمدہ تعمیری مقاصد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے پیش نظر جو سوال ہے اس کا تعلق جذبات سے نہیں، علم و بصیرت اور تفقہ و تدبر سے ہے۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ پاکستان میں وہ نظام زندگی کس طرح متشکل کیا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا؟ اور ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ہمارے عوام کے یہ جذبات بھی اس سے پہلے ضائع جاتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی متعین مقصد نہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ عوام بچارے نہایت خلوص نیت سے یہ قربانیاں "اسلام" کی خاطر دیتے ہیں اور ہمارے ہاں ابھی تک یہی متعین نہیں کہ اسلام ہے کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں ہر ذہن میں اسلام کا الگ مفہوم ہے۔ عوام کی اسلام کے ساتھ یہ محبت ایک نادیدہ محبوب کے عشق کے مترادف ہے۔ یعنی اقبالؒ کے الفاظ میں ہماری قوم کی کیفیت یہ ہے — دلے دارند و محبوبے ندارند۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ جذبہ لاشعوری طور پر کام کرتا ہے قوم بے پناہ قربانیاں دیتی چلی جاتی ہے اور جب وہ اس پر شعوری طور پر نگہ بازگشت ڈالتی ہے اور اپنے گردوپیش دیکھتی ہے تو اسے کچھ اور ہی نظر آتا ہے اور یوں ان کا وہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس کا ردعمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ عوام کے اس قیمتی جذبے کو مستقل شعار بنانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح مفہوم متعین کر کے اسے عملی نظام کی شکل میں متشکل کیا جائے جس کے حسین و خوشگوار نتائج اسے ان کی نگاہوں میں دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز بنا دیں اور یوں وہ اس کے تحفظ و بقا کی خاطر ہر قربانی کے لئے نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ علیٰ وجہ البصیرت ہر وقت تیار ہوں۔

باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریک پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے لیا گیا تھا، ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا، تو ان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریک پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائد اعظمؒ کے دشمنوں تک نے کبھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ "منافق" تھا — اور منافق بھی ایسا جو حصول مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا، اسے (exploit) کر رہا تھا۔ جد و جہد آزادی کے دس سالہ دور میں قائد اعظمؒ کی تقاریر، تحریرات، بیانات، خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ ... ہیں نہیں تو بربنائے مذہب۔ ہم اپنی جداگانہ مملکت

چاہتے ہیں تو اس لئے کہ

"ہم اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"

وہ واضح طور پر بتلاتے رہے کہ:

"پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"

جب پوچھا جاتا کہ تشکیل پاکستان سے ہو گا کیا تو وہ جواب میں کہتے:

"اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمت گزشتہ کو از سر نو زندہ کرے گی"

آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ایک دفعہ (۱۹۴۱ء) میں مسٹر گاندھی نے قائد اعظمؒ سے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ سیاست میں مذہب کو کیوں گھسیٹ لائے ہیں، تو اس کے جواب میں انہوں نے برملا کہا تھا کہ:

"میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو، مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا رہ کیا جاتا ہے!"

قائد اعظمؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی امتیاز کے متعلق جو کچھ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوال کے جواب میں بتایا تھا اس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

ہمارے یہ پاکستانی کرم فرما کہتے ہیں کہ جناح نے اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لئے چیکا رکھا تھا ورنہ اس کا مقصد کسی اسلامی مملکت کا قیام نہیں تھا۔ لیکن سنئے کہ اس زمانے کے ہندو کیا سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

"آپ کو کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیں! نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرز حکومت

قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے - مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان
مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔"

ہندو تو قائدِ اعظم کے اسلامی نعرے کو حقیقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ہمارے یہ مسلمان بھائی اسے "دروغ مصلحت آمیز" سے تعبیر فرماتے ہیں!

پھر اس کا کیا جواب کہ جب پاکستان بن گیا اور (بقول معترضین) قائدِ اعظم کے پیشِ نظر وہ مصلحت یا ضرورت نہ رہی جس کے تابع وہ اپنی ہربات کے ساتھ اسلام کا نام چپکائے رکھتے تھے تو انہوں نے اس وقت بھی اسلام کا نام نہ چھوڑا - انہوں نے جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اور جو غالباً ان کی زندگی کی آخری تقریر تھی ، اس میں انہوں نے کہا تھا:

"ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں - اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکے گا - ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو - صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضے سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے جائے اور نوعِ انسان کی بہبود مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے - یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

یہ تھی جناح کی آخری پکار جب اسے کسی 'مصلحت آمیزی' کی ضرورت نہیں تھی - وہ بے شک مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی بہبود چاہتا تھا لیکن صرف قرآنی نظام کی رو سے ، جس میں آج بھی یہ قوت موجود ہے کہ وہ ہر اس قوم کو جو اسے اپنا مسلک زندگی قرار دے لے نہ صرف مادی سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے بلکہ شرفِ انسانیت کی معراج کبریٰ تک پہنچا دے ـــــ "یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے "نصرت" کے گزشتہ شماروں میں جناب منظور قادر سے میرا ایک انٹرویو دیکھا ہوگا. منظور قادر صاحب نے جس نقطۂ نظر سے دین اور سیاست کے رشتے پر بات کی ہے وہ بظاہر آپ کے نقطۂ نظر کے قریب قریب برعکس ہے - انہوں نے اسلام کے مروجہ تصورات کو دیکھ کر یہ کہا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی یا معاشرتی قالبوں میں ڈھالنے سے ہمارے ہاں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

لیکن کیا ان کی یہ رائے آپ سے قریب نہیں کہ یہ فضا اسلام کے بارے میں مروجہ تصورات کی بنا پر ہے۔

پرویز : میں نے اس انٹرویو کی روئیداد "نصرت" میں دیکھی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے افسوس ہوا اور یہ اس لئے کہ میرے دل میں منظور قادر صاحب کی قانونی قابلیت کی بڑی قدر ہے۔ وہ ایک بلند پایہ وکیل ہیں اور مملکت پاکستان میں وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔ نیز مغربی پاکستان کی عدلیہ کے چیف جج بھی۔ ایک وکیل اور جج کی حیثیت سے مقدمات میں ان کے سامنے ہر قسم کا رطب و یابس پیش ہوتا ہے، جھوٹے دعوے دائر کئے جاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں اور انہیں اصل اور سچی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ منظور قادر صاحب کا منصب یہ ہے کہ وہ غلط کو صحیح اور جعلی کو اصلی سے الگ کریں اور پھر پیش نظر مقدمے کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچیں۔ مجھے افسوس اس بات سے ہوا کہ چھوٹے چھوٹے مقدمات تک میں تو وہ اس طریق کار کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب ان کے سامنے "اسلام کا مقدمہ" پیش ہوا تو انہوں نے اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جو باتیں اسلام کی طرف منسوب کر کے ان کے سامنے پیش کی گئیں اسے انہوں نے عین اسلام قرار دیدیا اور پھر اس کے خلاف ڈگری صادر کر دی۔ انہوں نے خدا، رسول وحی، عبادت، گناہ، ثواب، توبہ، صدقہ وغیرہ کے خلاف اپنے اعتراضات کی بنیاد ان باتوں پر رکھی جو معاف فرمائیے، ہمارے ہاں داستاں سرا واعظوں اور قصہ گو خطیبوں کے یہاں یا پکی روٹی جیسی کتابوں میں لکھی ملتی ہیں۔

حنیف : پرویز صاحب! کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد اسی اسلام سے واقف ہیں جو پکی روٹی اور واعظوں کے خطبوں سے مرکب ہے۔ اس لحاظ سے اگر منظور قادر صاحب نے کہا ہے کہ اسلام کی مروجہ شکلیں اس لائق نہیں کہ ان سے وہ نتائج پیدا ہو سکیں جن کی ہمیں آرزو ہے تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ منظور قادر صاحب خود بھی اکثر مروجہ عقائد سے مطمئن نظر نہیں آتے۔

پرویز : اگر منظور قادر صاحب یہ فرماتے کہ ان کے اعتراضات ان عقائد، تصورات اور رسومات کے خلاف ہیں جنہیں آجکل اسلام کے نام سے موسوم کر کے پیش کیا جاتا ہے تو ان کی تنقید حق بجانب ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں کچھ نرم سی تصور کی جاتی۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ — بالارادہ یا بلا ارادہ، وہ حقیقی اسلام کے بعض بنیادی تصورات تک کو بھی اپنی تنقید کی زد میں لے آئے ہیں اور اس تنقید کی بنیاد وہ عقائد و تصورات ہیں جو ہمارے ہاں بلا سند و تحقیق متوارث چلے آرہے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کی تیئیس سالہ زندگی میں جو جو واقعات سامنے آئے قرآن نے ان کے متعلق ہدایت دی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ ظاہر ہے کہ اس تیئیس سال کے عرصے میں محدود واقعات ہی

سامنے آسکتے تھے، سب کے سب نہیں۔ نیز نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد واقعات کا سلسلہ ختم نہیں ہوگیا، ہر نئے دن نت نئے واقعات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآن میں دی ہوئی راہ نمائی اس زمانے کے لئے تو کافی ہوسکتی تھی، یہ نہ تو ابدی ہوسکتی ہے اور نہ ہی ایسی مکمل کہ گزشتہ، موجودہ اور آنے والے تمام واقعات وحوادث کو محیط ہوسکے۔ یہ تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور (جیسا کہ انہوں نے بیان کیا ہے) مبنی ہے "شان نزول" کے نظریئے پر۔ لیکن اگر موصوف "مرد جہ اسلام" سے قطع نظر کرکے خود قرآن کریم پر غور فرما لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ "شان نزول" کا نظریہ خود قرآنی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ قرآن کریم اس کی بار بار تصریح کرتا ہے کہ یہ وہی دین ہے جسے خدا نے نوحؑ کو دیا۔ ابراہیمؑ کو دیا۔ موسیٰؑ کو دیا، عیسیٰؑ کو دیا، تمام سابقہ انبیاء (علیہم السلام) کو دیا۔ سو جو دین روز اول سے چلا آرہا تھا اس کے متعلق یہ کہنا کہ دین کی حقیقت سے بے گانگی کی دلیل ہے کہ وہ مجموعہ ہے ان ہدایات کا جو ان واقعات کے پیش نظر دی گئیں جو رسول اللہؐ کی زندگی میں اور اس معاشرے میں پیش آئے اور بس۔ اور پھر جس دین کے متعلق قرآن میں یہ کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تمام نوع انسان کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو محیط نہیں ہوسکتا، قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے۔

قرآن کریم میں دی ہوئی ہدایات کے متعلق منظور قادر صاحب کا یہ ارشاد کہ وہ (trial and error) کے تجرباتی طریق کا نتیجہ تھیں، وحی کے تصور کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے (trial and error) عقل انسانی کا طریق ہے جو مستقبل کا علم نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس وحی ہے جو عقل انسانی کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اس خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کا علم حدود فراموش ہے۔ لہٰذا اسے عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ منظور قادر صاحب کے اس دعوے کی بنیاد "ناسخ ومنسوخ" کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ عقیدہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف اور بعد کا وضع کردہ ہے۔ اس کے لئے بطور مثال انہوں نے شراب کی ممانعت سے متعلق قرآنی احکام پیش کرکے فرمایا کہ دیکھئے! یہ احکام کس طرح بتدریج آئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ (TRIAL AND ERROR) کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اتنی فرصت نہیں کہ میں شان نزول یا ناسخ ومنسوخ جیسے نظریات پر تفصیلی بحث کروں، نہ ہی اس کا تعلق آپ کے سوال سے ہے۔ البتہ ممانعت خمر سے متعلق احکام والی مثال کے سلسلے میں اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تدریجی احکام (TRIAL AND ERROR) کے استقرائی طریق کا نتیجہ نہیں تھے، اس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ افراد میں جو برائیاں اس طرح زمین گیر ہوچکی ہوں کہ ان کا ایک دم استیصال طبعی طور پر ناممکن ہو ان کی اصلاح بتدریج کرنی چاہیئے۔ شراب جس شخص کی گھٹی میں پڑ چکی ہو

اس کے لیئے اس کا یک لخت چھوڑ دینا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اس کی یہ عادت بتدریج چھڑانی چاہیئے۔ یہ تھی مصلحت اس قسم کے احکام کو بتدریج نافذ کرنے کی۔ چنانچہ اگر ہمیں آج بھی اپنے معاشرے میں شراب بند کرنا ہو تو اس کے لئے قرآن کریم کا تجویز کردہ تدریجی طریق ہی اختیار کرنا ہوگا۔

حنیف: پرویز صاحب! مہربانی سے ذرا دو ایک مثالوں سے واضح کریں کہ قرآن حکیم اپنے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی، معاشرتی اور معاشی تقاضوں سے کیونکر عہدہ برا ہوتا ہے۔

پرویز: جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے قرآن کریم کے ابدی اصول اس چار دیواری (BOUNDARY) (Lines) کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم ہر زمانے میں عملی پروگرام خود وضع کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا غیر متبدل اصول یہ ہے کہ (د امرھم شوریٰ بینھم) "امت مسلمہ کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے"۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ اصولی حکم بھی دے دیا کہ (د من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون) "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں"۔ ان اصولی ہدایات کے پیش نظر ہمارا طریق کار یہ ہوگا کہ جو معاملہ ہمارے سامنے آئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اس راہ نمائی کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی مشورے سے یہ طے کیا جائے کہ اس معاملہ کے متعلق ہمیں کیا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس باہمی مشورے کا طریق عمل کیا ہوگا، یہ حالات کے ساتھ بدلتا جائے گا — رسول اللہؐ اور صحابہؓ کے زمانے میں جب وسائل رسل و رسائل محدود تھے اور طریق تھا۔ آج اس کا طریق اور ہوگا۔ مشاورتی نظام کا اصول غیر متبدل رہے گا۔ البتہ اس نظام کی عملی شکل حسب ضرورت بدلتی جائے گی۔ یا مثلاً قرآن کریم کی اصولی راہنمائی یہ ہے کہ تمام افراد اور ان کی اولاد کی۔ بنیادی ضروریات زندگی کی بہم رسانی نظام معاشرہ کے ذمے ہوگی۔ (نحن نرزقکم و ایاھم)۔ اب یہ کام نظام معاشرہ کا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرے کہ معاشی نظام کی ہیئت کیا ہو جس کی رو سے کوئی فرد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور سامان نشو و نما سے محروم نہ رہے۔ اس نظام کی شکلیں حسب ضرورت بدلتی جائیں گی۔ لیکن یہ اصولی مقصد اپنی جگہ قائم رہے گا۔

حنیف: شراب کی حرمت پر بات کرتے ہوئے آپ نے بعض معاشرتی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے قرآن کے تدریجی طریق کار کا ذکر کیا ہے۔ میں ایک ضمنی سوال کا موقع نہیں کھونا چاہتا۔ قرآن کریم میں معاشرتی جرائم کے لئے سزائیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً چوری کے سلسلے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی انتہائی سزا ہے نہ کہ ابتدائی۔ کیا حرمت شراب کی طرح سزاؤں کے سلسلے میں بھی منزل بہ منزل چلنے کا حکم نہیں۔ اور کیا منزل بہ منزل چلنا اس لئے ضروری نہیں کہ جرائم کا معاشرتی نظام کے حالات سے اٹوٹ تعلق

ہے۔ یہ تو دھاندلی ہوگی کہ معاشرتی حالات تو بے شک غیر اسلامی ہوں اور سزائیں اسلامی دینی شروع کر دی جائیں۔

پرویز : آپ نے صحیح سمجھا ہے کہ قرآن کریم نے جرائم کی جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ انتہائی ہیں لیکن اس سے کم تر یا تدریجی سزائیں اس نے خود متعین نہیں کیں۔ اسے اس نے حالات کے مطابق نظامِ معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ واضح ہے کہ سزا تجویز کرتے وقت متعدد حالات و کوائف کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً معاشرے کی عام اخلاقی سطح، معاشی حالات کے تقاضے، خود ملزم (یا مجرم) کی نفسیاتی کیفیت، اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول و عواطف کے اثرات وغیرہ۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ قرآن کریم نے لونڈیوں کے لئے زنا کی سزا آزاد عورتوں سے نصف مقرر کی ہے اور اضطراری حالت میں ان چیزوں کے کھا لینے کی بھی اجازت ہے جو عام حالات میں حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ وہ اصول تھا جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو کوئی سزا نہیں دی تھی جنہوں نے بھوک سے مجبور ہو کر خوراک کی چوری کی تھی بلکہ سزا ان کے مالکوں کو دی تھی کہ ان کے جرم کے ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے تو یہ کیوں چوری کرنے پر مجبور ہوتے! لہٰذا غیر اسلامی معاشرے میں اسلامی سزائیں اَن مَل بے جوڑ سی بات ہے۔ اسلام کے اصول و احکام، مؤکدات و تنبیہات، اوامر و نواہی، فرائض و واجبات، حقوق اور ذمہ داریاں اسلامی نظامِ معاشرہ کے مختلف پرزے ہیں۔ یہ اسلامی نظام کے اندر اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نظام نہ ہو تو ان کی کیفیت ایک مشینری کے بکھرے ہوئے پرزوں کی سی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ (فادخلوا فی السلم کافۃ) "تم اس نظامِ خداوندی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔" اور اس کے برعکس سختی سے کہا ہے کہ "کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھو اور دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جتنے حصے پر ایمان رکھو اس کے خوشگوار نتائج تمہیں مل جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا میں ذلت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت میں عذاب شدید۔" (البقرہ: ۸۵)۔

لیکن یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم اپنی موجودہ سطح سے ابتدا کریں گے تو اس معاشرے کے انتہائی نقطے تک بتدریج پہنچیں گے۔ اس نسبت سے ہمیں جرائم اور ان کی سزاؤں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ سزا تو ایک طرف، حضرت عمرؓ نے ایک ذمی کا یہ کہہ کر ٹیکس واپس کر دیا تھا کہ تم ابھی حال ہی میں اس حکومت کے زیر حفاظت آئے ہو، اس نے تمہارے لئے کیا کیا ہے جو تم اس کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے آگئے ہو!

باقی رہا دین اور سیاست کا اٹوٹ رشتہ، سو اس کے متعلق بھی ہمارے یہ معترضین ایک غلط فہمی میں

مبتلا ہیں۔ اس تعلق کی وضاحت ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن کریم میں ایک اصولی حکم دیا گیا ہے کہ (لا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا) "کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو" یہ ہمارا دین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی حالت میں اور کسی قوم کے سلسلے میں بھی اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی وقت اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ خدا کی بارگاہ میں مجرم قرار پاتا ہے۔ اور اگر (معاذ اللہ) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس اصول کو نہیں مانتا تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔ یہ ہے وہ دین جسے سیاست سے الگ کر دیا جائے "تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اس کے برعکس وہ سیاست ہے جس میں ہر معاملے کا فیصلہ "مصلحت" پر مبنی ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نہ کوئی غیر متبدل اصول ہوتے ہیں نہ اٹل ضوابط۔ "مصلحت" کے مطابق اصول وضوابط مرتب ہوتے ہیں اور مصلحت ہی کے مطابق ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سیاست ہے جس سے دنیا اس قدر مادی ترقی کے باوجود جہنم بن رہی ہے۔

حنیف: جب ہم عمل کے میدان میں دین اور سیاست کے رشتے کی کڑیاں تلاش کرتے ہیں تو اسلام اور جمہوریت کے باہمی تعلق کو زیر بحث لانا لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اچھائی کا حامل اسلام جمہوریت کی خوبیوں سے بھی متصف ہے ـــ اسلام کے دامن میں جمہوریت کی خوبی باہمی مشورے کے حکم کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن جہاں تک جمہوریت کے مروجہ نظام کا تعلق ہے سیاسی جماعتوں کے بغیر اس کا تصور بھی لوگوں کے لئے محال ہے اور ادھر اسلام ہے کہ وہ کسی قسم کے تفرقے یا پارٹی بازی کا محل نہیں۔ اس صورت میں آپ کے نزدیک ہمارے دین اور ہماری سیاست کے درمیان کون سا مقام اتصال ہے جہاں جمہوریت سے وابستگی کا شوق بھی پورا ہو سکے اور وہ راہ بھی ہم سے نہ چھوٹے جو خدا نے سورۃ المائدہ میں اسلام کے نام سے ہمارے لئے چنی تھی۔

پرویز: حنیف صاحب! جس طرح اسلام ایک اصطلاح ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں جمہوریت بھی ایک اصطلاح ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ان مباحث کے متعلق صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ متعین طور پر معلوم کر لیں کہ قرآن کریم کی رُو سے "اسلام" کا مفہوم کیا ہے۔ جب یہ متعین ہو جائے تو اس کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ "جمہوریت" کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پیش نظر سوال پر غور کیا جا سکے۔

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں، اس سے ہمیں ایک ایسا نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حسن اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر

نہیں ڈالا - لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا مجھے یہ کہنا ہے کہ نبی کریمؐ کی زندگی جسے خود قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے، قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں ڈالتی ؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حکم تو قرآن ہی ٹھیرا - لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول، ایک عبد اور بشر، ایک سربراہ مملکت، ایک سپہ سالار، وحی کا حامل، وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبی اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں ؟ اور کیا قرآن حکیم اور نبی کریمؐ مل کر اسلام کے تصور کو معین اور واضح نہیں کر دیتے ؟

پرویز: قرآن حکیم کی رو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور بس - اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں - قرآن کریم نے اسی لئے نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تاکہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے - یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے - اس لئے کہ اگر یہ کچھ ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضورؐ کی سیرت نوع انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی -

پھر قرآن کریم نے خود نبی اکرمؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ: مشاورھم فی الامر - معاملات میں اپنی امت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو - اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے، فوق البشر نہیں تھے - لہٰذا قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا - اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے - بنا بریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے، اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے - قرآن کریم میں اسلام کا تصور مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں - اس تصور کو عملی شکل میں سب سے پہلے نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا - یہ تصور اپنی جگہ مکمل، واضح اور غیر متبدل ہے - اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا - البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا - اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے -

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں - ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام

جو قرآن کریم میں دیئے ہوئے نقشے کے مطابق متشکل ہو۔ اب لیجئے "جمہوریت" کو۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شد و مد سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ

قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے۔

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریق کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریق انتخاب، پارلیمانی یا صدارتی نظام، حزب موافق و مخالف کا وجود، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے یہ اسلام کے اصول حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو، نہ کسی ڈکٹیٹر کو نہ قوم کو، نہ اس کے نمایندگان کو، نہ پارلیمان کو، نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں رد و بدل کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا، وہ قوم کے نمائندگان کی کثرت آراء سے تو ایک طرف، اگر ساری قوم کے اتفاق رائے سے بھی مرتب ہوا ہوگا تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال۔ سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکے گا۔ جو اس کے خلاف ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود مشرک (الروم، ۳۱) ہے، اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاست فرعونی کی ایجاد (القصص: ۴)۔ لہٰذا امت کی مجلس مشاورت میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا وجود قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآن کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلس مشاورت (پارلیمان) مرتب کرے گی تاکہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصد زندگی ہوگا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تاکہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متحدہ فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔ اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعت مومنین

یہ ہے " اسلامی نظام جمہوریت "

حنیف : پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رُو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز : جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں، یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اس لئے کہ میرے نزدیک قرونِ اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی متعین کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اوپر تک اٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیۂ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ "پارٹی ساز جمہوریت" کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں، حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں، یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا —— تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو

پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہیئے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی ــــ یہ منکرے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز ــــ تو مذاب الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرز زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے، اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے۔ لیکن منافقت کو، جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو، اس نے بدترین طرز زندگی قرار دیا ہے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔

حنیف: نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب "فلسفیانہ انسائیٹ اور سیاست حاضرہ" میں کلکہون اور سارو کن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل کے قالب ان کے فلسفۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔ خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآن عظیم کی صورت میں کائنات، انسان اور ملتِ اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔ لیکن جب ہم اپنے سیاسی، معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذات باری، تصور دعا، تصور انصاف ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس سے جو حالتیں ابھر سکتی تھیں وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہوگی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا ہے جو ہم گالیوں اور کفر کے فتووں کی صورت میں ہر مصلح دین

پر اٹھاتے رہے ہیں — یہاں تک کہ ہم نے یہاں سرسیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اس انعام سے نوازا۔

پرویز: یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحبِ ضربِ کلیم کا حریف نہیں ہو سکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اس طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کریں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتووں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصورات ہوتے ہیں جن پر اسلامی ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصورات اور ان کا صحیح مفہوم آجائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصورات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ کوئی ایسی

ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ یہ تصور جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہوسکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب "اللہ" کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کر لئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک۔ تو ہم تسکین پا سکتے ہیں۔ اس تصور کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصورات کو خدا کے عطا کردہ تصورات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں کے خود ساختہ تصورات کو قرآنی تصورات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک، یا یوں کہیے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون، ہر ہامان اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے۔ اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لا الٰہ نہیں کہتے اِلّا اللہ پر آ ہی نہیں سکتے۔ یہی انبیاء کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہوگا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا الٰہ میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف : قرآن حکیم نے ایک جگہ کہا ہے:

> "کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفانِ حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ! تیری نصرت کب آئے گی۔" (البقرہ: ۲۱۴)۔

خداوند کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلا کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوق تسہیل (Over Simplification) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں۔ تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسر یا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کٹھنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ تعلیم کو مشکل بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں ـــــــ

(Over Simplification) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں صوم و صلوٰۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ ادھر عملی سطح پر دو دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گرداننے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے جیسی ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کمیونزم سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لے کر کرتے تھے حالانکہ داس کیپیٹال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے مگر نقد علم کمیونزم پر چند سفنت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

پرویز: غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا "سمجھنا" گیت وویا "سے کم مشکل نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصولِ ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی۔ اور حصولِ جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ "جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے (ابوداؤد)۔ اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی)۔ اب جھولا نیچے آیا تو قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے اسے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیر کے سمجھنے کے لئے۔ باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہمو سماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات "نیک عملی" ہے۔ جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اسے کر لیا کرے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

دین ایک عالم گیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفریں تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین اور تابندہ ہے۔ اس کے بعد افرادِ معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو۔ نہ خود ذلیل ہوجیئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حلیف: پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ نے برسہا برس تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے

اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے، کہ دین کے اس بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے، بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی روح کو پا لیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلاف مقاصد کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کا مقصد اپنے پندار کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہم عصروں پر اپنے علم و فضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا، یہ انہوں نے پا لیا۔ لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو از خود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے:

"ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے چن رہے ہیں"

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف، مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف: پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا آپ کے فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کئے؟

پرویز: حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکان اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے وہ اس نظام کے ستون ہیں، یا یوں کہیئے کہ ان کے

پروگرام کے لاینفک اجزا ہیں۔ اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل وصورت تو باقی رہ جاتی ہے، ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا اپنا پیام یہ ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جز بنایا جائے تاکہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں موجودہ حالات میں بھی، جب کہ وہ نظام موجود نہیں، ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساس زیاں بیدار ہوا، انہی ارکان کے "حشر اجساد" سے ہمیں حیات نو عطا ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلغ کی رکھی ہے، داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہو سکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہئے۔ میرے "حاقۂ سخن" میں ایسے ارباب فکر وعمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزا بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد اجاگر کیا ہے، لیکن عمل صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمارا عمل بے شک اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں۔ یہ نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے، نہ جبر سے، نہ معاشرے کی ملامت سے، نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اولین ہے۔ لیکن آجکل ایک انداز فکر ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھیرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس انداز فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے، چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے چناؤ ہو گا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر، بے درد اور غیر ذمہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں، مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ بحثیں ہوتی ہیں کہ

اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے، اس کے قول فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رسوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

PERSONAL KNOWLEDGE polanyi کا برسوں کا کام

اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام تر معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظر انداز کر کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا:

عبس و تولیٰ ۝ ان جاءہ الاعمیٰ ۝ و ما یدریک لعلہ یزکیٰ ۝ (۸۰:۱-۳)

کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز: جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا؟ اس لئے بنیادی اہمیت افراد ہی کو حاصل ہے۔ صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہوگی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہوگا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصور ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے "مذہب" کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امت کی

تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تاکہ دین کا صحیح تصور ان کے سامنے آسکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیر العقول انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے۔ اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہو تو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصورات اور ان کے انسانیت ساز جنت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلب انسانی کی گہرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اسکے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں)۔ جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر سنچتہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبی اکرمؐ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی قانون کا اعلان ان پر بعد میں کیا گیا تھا۔ لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اُس وقت جو معاشرہ تشکل ہوا تھا وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے، وہ بس مسلمان ہیں۔ ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح "مسلمان کرنا" چاہیئے جس طرح نبی اکرمؐ نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کے

ذریعے ـــ لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑا جا سکتا، انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے - تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو؟ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی اصلاح ہو جائے گی۔

میں اسے پھر واضح کر دوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے جب تک پرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی - لیکن پرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے - ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں - اس کا عدم وجود برابر ہے، اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افراد معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے - اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروف نقل و حرکت رہتے ہیں - اس کے برعکس افراد معاشرہ ذی حیات اور قابل نشو و نما نفوس ہوتے ہیں - اس نظام کے اندر ان کی نقل و حرکت بالارادہ ہوتی ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے - یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس سے خود افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے - اس طرح اس نظام اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے - یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے - یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں - دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے وہاں نظام کا تصور نہیں ہوتا - (مذاہب عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے) - یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے - فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبال نے اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آرا ز نگہدار خود است
ایکہ در قافلہ با ہمہ رو بے ہمہ شو

حنیف :۔ خداوند کریم نے قرآن میں انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق و انفس میں تلاش کرے۔ جہاں تک آفاق کا تعلق ہے علوم و فنون کی راہ سے، سمع و بصارت اور ذہن کی راہ سے انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور مت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک انفس کا تعلق ہے علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔ سری آروبندو نے "حیات ربانی" میں اور اوسپنسکی نے "اعجاز کی تلاش" میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارے یہاں اقبالؒ نے مکان دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوف کی صحیح تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سرچشمہ نصیب ہو جائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے؟

آج ہم اضطراب، نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بنا یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوف کا جوہر — یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش — ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتا جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز :۔ تصوف ایک اصطلاح ہے اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اس کی تائید و تردید میں بات کرنا مفید نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں، حتیٰ کہ اس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ، مشاہدہ اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی — جو انبیاء کو ملتی ہے — وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے، کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا، حقیقت، خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (Objectivity) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی سرچشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج

حقیقت کا علم خدا سے براہ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوت کا مدعی ہے۔

تصوف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیل صوفیا شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوف کی وہ بنیاد ہے جو ختم نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرن اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصور جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے"

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے اسلام کی اولیں مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوام عالم کے اندر بھی لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات پر تاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی مضمر پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت، بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت، نظم و ضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت، زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ کے اسوۂ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھا لیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوت ارادی کو اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سمادھیوں، مغبچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کی ایک سنجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقیں کرے۔ مگر توہم پرستی کی تاریکیوں میں اس کو "روحانیت کی کرامات" قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں - دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین و جمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتب ہے وہ کاروانِ انسانیت کو اس منزلِ مقصود کی طرف لیجاتا ہے جو شرف و تکریمِ انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز بتایا ہے (اناک لعلیٰ خلق عظیم اس پر شاہد ہے) صحابۂ کبارؓ کے بھی حسنِ سیرت و بلندیِ کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے، ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا - اس نے جہاں قوموں کے عروج و زوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی - تو اس سے قوموں کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے - تصوف کی رو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں - تصوف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا - قرآن کے لغت میں تصوف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہن انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے - تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔

حنیف : ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاء کرام کی مرہونِ منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے، بلکہ اہل تصوف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے - پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ، شیخ احمدؒ سرہندی، شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا بلند پایہ مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے - کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز : حنیف صاحب ! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں - یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ: تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون۔

"یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے، جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے۔ اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔" لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین، ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابلِ ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

نقد و نظر

ندائے حق | شائع کردہ — کلاسیک - ۴۲- دی مال - لاہور۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت چھ روپے

پاکستان اور بھارت کے حالیہ ٹکراؤ میں پاکستان کی نشریگاہوں نے نفسیاتی محاذ پر جو فریضہ سرانجام دیا۔ اس میں "ندائے حق" کا پروگرام خصوصی اہمیت کا حامل رہا۔ اور اس میں "بھلے شے جی کی زبانی" "آکاش وانی کی لالائی ذہنیت" کے پردے جس حسن و خوبی سے چاک کئے گئے اس نے لاتعداد پاکستانیوں سے داد تحسین وصول کی۔ "ندائے حق" کے اس ریڈیائی پروگرام کی ۱۶ ستمبر تک کی کڑیاں "کلاسیک" لاہور کے پروپرائٹر آغا امیر حسین صاحب کی سعیٔ بلیغ سے ایک کتابی صورت میں یکجا ہو گئی ہیں اور اس طرح نصیر انور صاحب کی یہ یادگار پیشکش جو جنگ کے دنوں میں ریڈیائی لہروں کی وساطت سے فکر و بصیرت کا سامان پیدا کرتی رہی ایک خوبصورت کتاب بن کر منظرِ اشاعت پر آگئی ہے۔ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر آفسٹ میں شائع ہوئی ہے۔ اور اس کا دیدہ زیب گرد پوش ہندوانہ تصورات کی عکاسی کرتا نظر آئے گا۔ کتاب میں ایک کمی جو محسوس ہو رہی ہے وہ ہندی الفاظ کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ ضرورت تھی کہ حاشیے میں ساتھ ساتھ ان کی وضاحت کر دی جاتی۔ کتاب کی فروخت کی تمام آمدنی پاکستان کے دفاعی فنڈ کی نذر کئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔

یہ پروگرام (ندائے حق) ابھی تک مسلسل جاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی بقایا کڑیاں بھی اسی طرح شائع ہوتی رہیں گی۔

بیادِ قائدِ اعظم

دیکھا جو تیرا نقش، قدم منزلیں ملیں

(صفدر سلیمی)

اقوام عالم کے سلسلۂ عروج و زوال پر نگاہ دوڑائیے۔ تو یوں نظر آئے گا۔ گویا زندگی کے بحرِ متلاطم کے سینے پر ان کے سفینے اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی کشتی اپنے ساحلِ مراد سے ہمکنار ہے۔ کوئی سرکش موجوں کے ہجوم میں اپنی راہ ہموار کر رہی ہے۔ کسی کو تلاطم نے اپنی زد میں لے رکھا ہے۔ کسی نیا کے کھیون ہار طوفانوں میں دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ کہیں بحری قزاقوں نے اپنی دستبرد سے کمزور سفینوں میں تباہی مچا رکھی ہے۔ کوئی ان بپھری ہوئی موجوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر آخری سانس تک لڑتے جا رہا ہے۔ کہیں کشتی کے مسافر خود اپنی کشتی میں ہی چھید کرنے لگے ہیں۔ کہیں اپنے انجام سے بے نیاز ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ زندگی کے سمندر میں اقوام و ملل کا یہ سلسلۂ روز و شب صدیوں سے جاری ہے۔ کتنے ہی سفینے ہمیشہ کے لئے ان طوفانوں میں کھو کر رہ گئے۔ کتنی کشتیاں غرقِ آب ہوئیں۔ اور تاریخ پھر ان کا سراغ نہ دے سکی۔ کتنی قومیں تھیں۔ جو اپنی اپنی نیا کو کھیتی ہوئی ساحلِ مراد تک پہنچتی رہیں۔

وہ دیکھیئے سامنے ساحل سے بہت دور ایک کشتی طوفانوں سے کھیلتی ہوئی اپنی منزلِ مقصود کی جانب بڑھ رہی ہے یہ ملتِ پاکستان کی نوخیز امنگوں اور عزائم کا سفینۂ حیات ہے۔ اور ایک ہولناک بھنور کو شکست دے کر نئے طوفانوں کے ہجوم میں آگے ہی آگے بڑھا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی سے ابتلاؤں اور آزمائشوں کی محشر خیز ہلاکت سامانیاں وابستہ ہیں۔ اور اس پر ایک ایسا کڑا وقت بھی آیا ہے۔ جب اس کے پتوار تک کھو گئے تھے۔ اس کے مسافر ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار تھے کئی ایک بحری قزاقوں سے پیمانِ وفا استوار کر چکے تھے۔ کئی ایک اس کی تہ میں چھید کئے جا رہے تھے۔ مایوسی اور شکست کے اس گرد و غبار میں اس کی منزلِ مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی تباہی کا مرحلہ کس قدر قریب ہے

منزلِ مقصود کا رُخ

اس ہوش ربا کیفیت میں ایک مردِ راہ بیں اور پیکرِ عزم و دانش اس کی ناخدائی کی امنگیں لے کر آگے بڑھا۔ اور اس ڈوبتی ہوئی نیا کو مردانہ وار کھیتا ہوا ساحلِ مراد کی طرف لے آیا۔ وہ سمندر کی موجوں سے لڑا۔ حوادث کے طوفانوں سے وقفِ پیکار ہوا۔ اغیار پرستوں اور قومی سلامتی کے دشمنوں سے ٹکرایا

اور ایک دن اہل کشتی کا خراجِ تحسین حاصل کرنے کے قابل ہوگیا۔ یہ محسنِ قوم تھا۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح۔ ان سطور میں ہم اسی ناخدائے ملت کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ۲۵ دسمبر کا دن اسی میرِ کارواں کے یومِ ولادت کی تقریب کا آئینہ دار ہے۔ ٹھیک ترتالیس سال قبل اپنی زندگی میں ہی اس تقریب پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اس قائدِ جلیل نے فرمایا تھا۔

گذشتہ دو صدیوں سے مسلم ہندوستان کی کیفیت اس جہاز کی سی چلی آرہی تھی جس کے پتوار نہ ہوں۔ اس کا کوئی ناخدا نہ ہو۔ اور وہ چٹانوں سے بھرپور سمندر میں ہچکولے کھا رہا ہو۔ دو سو سال سے وہ برابر شکستگی، بدنظمی اور ابتری کے عالم میں برابر سطحِ آب پر تیرتا چلا آرہا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں بہت سے رفقاء کو لے کر ہم نے اس کی مرمت شروع کی۔ آج یہ جہاز حیرت انگیز چپوؤں سے آراستہ ہے۔ اور اس کا ناخدا اسے ساحل تک پہنچانے کا عزم لئے ہوئے ہے۔ اس کے کل پرزے اب ٹھیک ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ اسے وفادار ملاحوں اور کمانڈروں کی خدمات حاصل ہیں۔ اور گذشتہ پانچ برس سے — وہ ایک عظیم معرکہ میں شریک ہے۔ (خطاب یوم ولادت — ۲۵ دسمبر ۱۹۴۲ء)[1]

اپنی قوت پر اعتماد

وہ دیکھئے! اسی سال وہ ۱۳ ستمبر کو کانگرس کی سول نافرمانی کی تحریک سے متعلق دلی میں ایک عظیم الشان پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کس مصمم عزم کا اعلان کر رہے ہیں۔

فرض کیجئے۔ کہ برطانوی پالیسی کیخلاف تلخی اور غم و غصے سے کام لیتے ہوئے مجھے یہ اعلان کرنا پڑے — کہ برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ تو پھر مجھ پر یقین کیجئے۔ کہ ان مشکلات کے مقابلے میں جن سے وہ آج (کانگرس سول نافرمانی کی وجہ سے) دوچار ہے۔ آپ پانچ سو گنا زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سوال اسلحہ کا نہیں۔ اس کے بغیر بھی ہم پانچسو گنا زیادہ آفتیں برپا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ اس ملک کا ہر ذی فہم آپ کو بتا دے گا۔ میرا مقصد ہندوؤں کو مرعوب کرنا نہیں۔ بلکہ مسلمان کی سرشت ہی اس خمیر سے ترتیب پائی ہوئی ہے۔

اس موقع پر جب ایک غیر ملکی نامہ نگار نے سوال کیا کہ۔

کیا آپ کے اس اقدام سے فوج اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان بھی متاثر ہوں گے؟

تو انہوں نے فوراً کہا۔

میرا فوج سے کوئی تعلق نہیں۔ میں خونریزی کی ان تفاصیل میں بھی نہیں جانا چاہتا لیکن مجھے احساس ہے کہ جب پینسٹھ فی صد فوج مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ تو مسلم لیگ کی مہم فوج کے

---

[1] (SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH - VOL. I — P-502)

ایک عظیم طبقہ پر اثر انداز ہوگی۔ اور اس کے علاوہ سرحدی قبائل میں بھی ایک آگ سی بھڑک اٹھے گی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق افغانستان، ایران، عراق، ترکی، مصر جیسے مسلم ممالک کو مسلمانانِ ہند کے مطالبات سے پوری ہمدردی ہے۔ اور وہاں کے اخبارات بھی مطالبۂ پاکستان کی پرزور تائید کر رہے ہیں۔ اس بنا پر مجھے یقین ہے کہ اگر برطانوی حکومت اور مسلمانوں میں لڑائی چھڑ گئی تو لازماً وہ تمام ممالک اس کا اثر قبول کریں گے۔ (۵۶/۲۰ - ایضاً)

ذمہ داریاں اور ان کے تقاضے

اسی سال (اکتوبر ۱۹۴۲ء) میں وہ اپنے عید الفطر کے پیغام میں قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

آیئے! اس عظیم اور مبارک دن یہ عہد کریں، کہ آج اور مستقبل کے نئے عالمی نظام میں اپنی اسلامی روایات کی روشنی میں ہم اپنا حقیقی مقام حاصل کرینگے۔ مسلمان فاتح، تاجر، مبلغ، اور معلم کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ تہذیب و تمدن لائے۔ انہوں نے عظیم مملکتیں قائم کیں۔ اور ایک عظیم الشان تہذیب کو جنم دیا۔ انہوں نے ہندوستان کے برصغیر کو تعمیرِ نو کے سانچوں میں ڈھالا۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر خطے کے مقابلے میں مسلم آبادی کی عظیم ترین جمعیت قرار پاتے ہیں۔ اپنی قومی تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے وہ دوسروں سے متمیز ہیں۔ وہ سب قوموں کی آزادی اور مساوات کے علمبردار ہیں۔ یہ مسلم ہندوستان کی تقدیر ہے۔ کہ آج کی عالمگیر کشمکش، مستقبل کے جدید نظام اور امن کے قیام کے سلسلے میں ایک موثر قوت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

اس لئے میں ہر مسلمان سے اپیل کرتا ہوں۔ کہ پاکستان کے نصب العین کے لئے وہ جم کر کھڑا ہو جائے۔ کیونکہ یہ ہماری اور اس برصغیر میں ہماری آئندہ نسلوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یا تو ہم پاکستان حاصل کر کے رہیں گے یا مٹ جائیں گے آج دنیا اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران میں سے گذر رہی ہے۔ اس عالمگیر جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کی ذمہ داری کسی دوسرے سے کم نہیں۔ آیئے آج یہ عہد کریں۔ کہ ہم ان ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔ (ایضاً -- ۵۸/۲۰)

برطانوی جمہوریت سنگینوں کے زور پر

۹ ستمبر ۱۹۴۲ء کو وہ نئی دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہیں۔ ملک بھر میں سول نافرمانی کا آغاز کر کے کانگرس پورے ملک کا تسلط حاصل کرنے کے لئے میدان میں آچکی ہے۔ تاریخ کا ایک نازک اور فیصلہ کن موڑ سامنے آ رہا ہے۔ سفینۂ ملت کا ناخدا کونسل سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے۔

ڈیڑھ سو سال سے جو حکومت یہاں قائم ہے۔ یہ عوام کی منظوری سے قائم نہیں ہوئی۔ یہ وہ نظام جمہوریت ہے۔ جو مغلوں کی حکومت پر غالب آیا۔ اور برطانوی سنگینیں اس کی وجہ جواز ہیں، نہ کہ عوام کی منظوری۔ عوام میں بیداری کی لہر پیدا ہو رہی ہے۔ اور اسی بنا پہ ہم اپنی آزادی کے طالب ہیں ہم اپنی سرزمین کے مالک آپ بننا چاہتے ہیں۔ اور برطانوی تسلط کو خیرباد کہنا پسند کریں گے۔ پاکستان کی تجویز اس سلسلے میں ہندوستان کی حقیقی آزادی اور استقلال کا حرفِ آغاز ہے۔

(ایضاً ۔ صفحہ ۶۵ م)

مرکزِ امید نئی نسل

درسگاہوں میں زیرِ تعلیم نوجوان اس سالارِ انقلاب کی امیدوں کا مرکز تھے۔ تحریکِ پاکستان کا پرچم بلند کرتے ہوئے انہوں نے بار بار ملت کے ان شاہین بچوں کو مخاطب کیا۔ ان کے سینوں میں امنگوں اور عزائم کے چراغ روشن کئے۔ انہیں حیاتِ اجتماعی کے نصب العین کا سراغ دیا۔ ان کی حقیقی منزل ان کی نگاہوں کے سامنے واضح کی۔ تحریکِ پاکستان کا آغاز ہوئے پورا ایک سال ہو رہا ہے۔ قوم اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے میدانِ تگ و تاز میں صف آرا ہو رہی ہے قوم کی عظمتِ رفتہ کا داعی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رُخ کرتا ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ کے اس خیابانِ آرزو میں جسے سرسید نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، قومی امنگوں کے گلہائے نودمیدہ سے یوں ہمکلام ہوتا ہے۔

پاکستان ایک قابلِ عمل نصب العین ہی نہیں۔ بلکہ یہ اس برصغیر میں اسلام کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد راستہ ہے۔ ابھی ہم نے ایک طویل منزل طے کرنی ہے۔ پاکستان بلاشبہ موجود ہے۔ لیکن اسے حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ یاد رکھئے۔ کہ آزادی حاصل کرنا آسان ہے۔ لیکن اسے برقرار رکھنا بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ انگلستان اور امریکہ آج آزاد ہیں لیکن سوچئے۔ کہ اپنی آزادی اور بقا کے لئے انہیں کس قدر جدوجہد کرنی پڑی۔ ہمیں ابھی اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ اس لئے اپنی صفوں کو مستحکم کرو۔ . . . .

ہمارے سامنے نہ صرف داخلی استحکام کے مسائل ہیں۔ بلکہ خارجی جارحیت سے مقابلہ بھی۔ آزادی کا حصول اور اس کا بقاء و استحکام چرخہ کاتنے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ہر لحظہ اپنی مملکت کے حصول اور اپنے مقدس تصورات کی حفاظت کے لئے آمادۂ پیکار رہنا چاہیئے۔ اور یقین رکھئے۔ کہ پاکستان ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔

(تقریر علیگڑھ یونیورسٹی یونین ۔۔۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء (تقاریر و تحریرات مسٹر جناح جلد اول) صفحہ ۲۶۷)

بساط سیاست کی مہرہ بازیوں پر فتح

نو ماہ بعد ۲. نومبر ۱۹۴۱ء کو وہ پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے ان نونہالوں کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس دوران میں وہ برطانوی حکومت کو ایک عظیم معرکہ میں شکست فاش دے چکے ہیں۔ والسرائے نے مسلم لیگ کو ایک آزمائش میں ڈالنے کا حربہ اختیار کیا تھا۔ اور متحدہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات کو جو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے۔ قائد اعظمؒ سے بالا ہی بالا ڈیفنس کونسل میں شامل کر لیا تھا۔ یہ دوسری عالمگیر جنگ کا دور تھا۔ ہنگامی قوانین حرکت میں تھے۔ سر سکندر حیات کا شمار برطانوی حکومت کے خاص الخاص حاشیہ برداروں میں ہوتا تھا لیکن معاملہ اصول، اور جماعتی وقار کا تھا۔ قائد اعظمؒ کی مجلس اعلےٰ کا رکن بلا مشورہ اور بلا اجازت ڈیفنس کونسل میں شریک کر لیا گیا تھا جماعتی نظم و ضبط اور وقار کا تقاضا تھا کہ سر سکندر حیات سے جواب طلب کیا جائے اور اگر وہ ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے کے لئے تیار نہ ہوں۔ تو ان کے خلاف انضباطی کاروائی عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ سر سکندر حیات کے نام نوٹس جاری کر دیا گیا۔ مسلم لیگ اور اس کے صدر ایک عظیم آزمائش کا سامنا کر رہے تھے۔ ایک طرف برطانوی سلطنت، سر سکندر حیات خود برطانیہ کا حاشیہ بردار، اور تیسری طرف ہندو کانگرس کی بے ضمیری۔ جو ایک طرف جنگی امداد کے بائیکاٹ کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھی۔ اور دوسری طرف قائد اعظمؒ کے مقابلے میں سر سکندر حیات کی پیٹھ ٹھونک رہی تھی۔ اور ہندو پریس کی طرف سے اُسے بانس پر چڑھانے کی کیفیت یہ تھی۔ کہ سٹیٹسمین جیسے بلند پایہ اخبارات اپنے افتتاحی مقالوں میں اُسے خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ اور تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ

> یہی ایک لیڈر ہے۔ جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔
>
> (مقالہ افتتاحیہ سٹیٹسمین - ۱۲ جولائی ۱۹۴۱ء)

ایسے عالم میں سر سکندر کو مسلم لیگ یا برطانوی ملوکیت دونوں میں سے ایک کے ساتھ پیمانِ وفا استوار رکھنے کا الٹی میٹم دیا گیا۔ یہ جناح کی سیاسی قوت کی آزمائش تھی۔ اور دنیا نے دیکھا۔ کہ اس آزمائش میں کامیابی، نے ان کے قدم چومے۔ سر سکندر معذرت اور ندامت کی تصویر بنے ہوئے قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آگے بڑھ والسرائے بہادر کی ڈیفنس کونسل سے اپنا استعفےٰ اُن کے ہاتھوں میں دے دیا۔ یہی قومی فتح تھی۔ جس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے علیگڑھ یونیورسٹی کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

> میں آج مسرور ہوں اور ہم اس اظہار فخر کے قابل ہیں۔ کہ ہم نے برطانوی حکومت کو ایک سبق سکھا دیا ہے۔ شر سے خیر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسلامی ہند نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ وہ پوری قوت سے مسلم لیگ کی پشت پر ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ

ہمارے مخالفین اس حقیقت کو آئندہ پیش نظر رکھیں گے۔ کہ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔

(SPEECHES AND WRITINGS —— VOL — I — P. 341)

قرآن کی واحد راہ نمائی ۱۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو سابق صوبہ سرحد کے نوجوان طالبعلم فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے نام سے اپنے صوبائی اجتماع کا انعقاد کر رہے تھے۔ انہوں نے اس موقع پر قائداعظمؒ سے نوجوان طلبار کے لئے ایک پیغام کی خواہش کی سنیئے وہ پیغام جو اس یادگار تقریب پر انہیں قائداعظمؒ کی طرف سے موصول ہوا۔ انہوں نے تحریر فرمایا۔

آپ نے مجھ سے ایک پیغام کی خواہش کی ہے۔ میں بھلا آپ کو کیا پیغام دے سکتا ہوں۔ روشنی اور راہنمائی کے لئے تو ہم سب قرآن کے عظیم ترین پیغام سے فیضیاب ہیں۔ (ایضاً۔ ص۵۱۶)

نوجوانوں کا صدقہ مئی ۱۹۴۴ء میں انہیں سیالکوٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ اور ان کے ایڈریس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

میں تمہاری طرح اب جوان نہیں۔ لیکن تمہارے پُرشباب جذبات اور جوش و خروش نے مجھے ضرور جوان بنا دیا ہے۔ یہ تمہاری گذشتہ سات سالہ ان تھک مساعی کا نتیجہ ہے۔ کہ میں محسوس کر رہا ہوں۔ کہ میرے ہاتھ اب کافی مضبوط ہو گئے ہیں۔ اور آج ہم یہ دعویٰ کرنے کے قابل ہیں۔ کہ ہم میں کوئی فرقہ نہیں۔ اب ہم ایک متحد قوم ہیں۔ اور ایک ایسا مسلمان نہیں۔ جو ہمارے نصب العین سے بے خبر ہو۔ اور نو اور ایک ایک بچہ بھی یہ جان گیا ہے۔ کہ ایک مسلمان کا مقصد حیات صرف پاکستان ہے۔ (ایضاً۔ ص۱۱۵۔ جلد دوم)

وہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو (۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو) مخاطب کرتے ہیں۔ اور ان کی ذمہ داریوں کے احساس کو جھنجھوڑتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

یاد رکھئے۔ کہ آج جو کچھ بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ کل اسی کی باگ ڈور تمہیں سنبھالنی ہوگی۔ اس لئے میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کہ کیا آپ نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا ہے۔؟ کیا آپ اپنے آپ کو منظم کر چکے ہیں۔؟ اور کیا آپ میں اپنی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتیں بیدار ہو چکی ہیں جو آپ پر عائد ہونے والی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آگے بڑھیئے۔ اور یہ اب کر لیجئے یہی موقع اس کے لئے مناسب ہے۔ اور میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

(ایضاً —— ص۲۹۳ جلد اول)

ذات پات کے ہتھکنڈے

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو انہیں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرنیکا موقع ملتا ہے۔ ان دنوں جاٹ کانفرنس کے نام پر یہاں جاٹ برادری کی جداگانہ تنظیم کا ہنگامہ بپا تھا۔ ہندو اور مسلمان جاٹ سر چھوٹو رام اور اس ذہن کے دوسرے رجعت پسند لیڈروں کی قیادت میں ایک نیا کھیل کھیل رہے تھے۔ ذات پات کے خطوط پر ابھرتا ہوا یہ رجحان نہ صرف اسلامی وحدت واخوت کے منافی تھا۔ بلکہ اس سے تحریک پاکستان کے متاثر ہونے کا بھی خدشہ تھا۔ قوم کے قائد نے قوم کے نوجوانوں کو اس خطرے کی اہمیت سے خبردار کرنا ضروری سمجھا۔ اور فرمایا:-

> اسلام اپنے دائرۂ اخوت میں ذات پات کا کوئی امتیاز گوارا نہیں کرتا۔ خود نبیؐ اکرم نے ان امتیازات کو ختم کیا۔ اور سرزمین عرب میں ایک ہئیت اجتماعیہ قائم کی۔ یہ اسی ذاتِ اقدسؐ کی قائم کردہ اساس محکم تھی۔ جو مسلمانوں کو اطراف و اکنافِ عالم میں بڑھا کرلے گئی۔ اور ایک دن وہ اسپین تک کے دروازوں کو دستک دے رہے تھے۔
>
> یہ حقیقت واضح ہو جانی چاہیئے۔ کہ مسلم لیگ کسی کو یہ اجازت نہیں دیگی۔ کہ وہ مسلمانوں میں اس قسم کے ہتھکنڈے بروئے کار لائے۔ ہمارا اوڑھنا بچھونا صرف اسلام ہے۔ یہاں شیعہ اور سنّی تک کا کوئی سوال نہیں۔ ہم ایک ہیں۔ اور ایک قوم کی طرح حرکت میں آئیں گے۔ یہی وہ صورت ہے۔ جو حصول پاکستان میں کامیابی سے ہمکنار کریگی۔ (ایضًا — جلد دوم صہ ۸۹-۸۸)

جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو انتباہ

ملت اسلامیہ کی آزادی کے حصول اور اس کی تعمیر و ترقی میں جس گروہ کی مفاد پرستیاں رخنہ انداز ہوتی آرہی تھیں وہ جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کا گروہ تھا۔ یہ طبقہ اپنے مخصوص مفادات کی خاطر، چڑھتے سورج کو پوجنے کا عادی تھا۔ اور اس مقصد کے لئے حسب ضرورت قوم کے اجتماعی مفاد کی بازی لگانے سے بھی فرق نہیں کرتا تھا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں قائد اعظمؒ نے اس طبقہ کو مخاطب کرنا ضروری سمجھا۔ اور فرمایا:-

> میں اس موقع پر ان جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کے لئے جو عوام کی محنت سے پھلے پھولے ہیں یہ انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ان کی یہ ذہنیت بدکرداری اور حرام خوری پر مبنی ہے جس نے انہیں خودغرضی کی اس انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ کہ ان سے کسی معقول روش کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ عوام کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے وہ اسلام کی ہدایات فراموش کر چکے ہیں۔ اور اس خودغرضی و مفاد پرستی نے انہیں اغیار کے مفاد کا

آلۂ کار بنا رکھا ہے۔
(خطبہ صدارت۔ سالانہ اجلاس دہلی۔ آل انڈیا مسلم لیگ)

بھارت کے مسلمانوں کا تحفظ

"۷ر اپریل ۱۹۴۶ء کو دلی میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگ سے وابستہ ارکان کی ایک تاریخی کنونشن منعقد ہوئی۔ عام ملکی انتخابات میں مسلم لیگ کو جو عظیم الشان تازہ فتح حاصل ہوئی تھی۔ یہ کنونشن اس کا ناقابلِ انکار مظاہرہ تھا۔ برصغیر کے طول و عرض سے آئے ہوئے اسمبلیوں کے وہ تمام ارکان اس کنونشن میں شریک تھے جنہوں نے اپنے رائے دہندگان کے اعتماد سے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور اس طرح کانگرس' برطانوی حکومت' اور ساری دنیا پر ثابت کیا تھا۔ کہ پورا اسلامی ہند مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ یہ کنونشن قائداعظم کی سیاسی قوت کا ایک غیر مبہم ثبوت تھا۔ اس موقع پر سب نے باری باری ہر ممکن قربانی کا حلف دیا۔ اور اس تائید سے مسلح ہو کر قائداعظم نے جو یادگار خطاب ارشاد فرمایا۔ اس میں اعلان کیا کہ:-

قیام پاکستان کے بعد ہم اپنی سلطنت کا آغاز لڑائی جھگڑوں سے نہیں کریں گے ہمیں خود اپنے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اور انہیں بھی۔ لیکن اگر انہوں نے اس کا آغاز کر دیا۔ اور اپنے ہاں کی مسلم اقلیت سے بُرا سلوک کیا۔ تو ہم خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار نہیں کریں گے۔ اگر برطانیہ لارڈ گلیڈسٹون کے عہد میں اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر آرمینیا کے معاملات میں دخل انداز ہو سکتا ہے۔ تو پھر ہمیں یہ حق کیونکر حاصل نہیں ہو سکتا؟ اگر ہماری اقلیتوں پر کہیں بھی کوئی دباؤ ڈالا گیا۔ تو ہم وہی راستہ اختیار کریں گے۔

پاکستان اور خارجہ پالیسی

۳ر اپریل ۱۹۴۶ء کو بی بی سی لنڈن کے نمائندہ مسٹر ڈونلڈ ایڈورڈ نے قیام پاکستان سے متعلق اہم امور کے بارے میں قائداعظمؒ سے (قبل از وقت) ایک خصوصی انٹرویو حاصل کیا۔ اس انٹرویو کے دوران میں جب قائداعظم نے آزاد ممالک سے پاکستان کے معاہدات کا ذکر چھیڑا۔ تو نمائندہ مذکور نے فوراً سوال کیا۔ کہ

کن ممالک سے جناب؟

ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ قائداعظم کا جواب تھا۔ کہ

"جس وقت میں اپنی حکومت سنبھالوں گا۔ تو آپ کو یہ بھی بتا دوں گا۔"

دولتِ مشترکہ سے پاکستان کے تعلقات کے بارے میں مسٹر ایڈورڈ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے واضح کیا۔ کہ:-

پاکستان اس معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوگا۔ کہ وہ دولتِ مشترکہ میں شامل ہو۔ یا اس سے علیحدگی

اختیار کرے۔ میں نہیں جانتا۔ کہ اس وقت کے حالات کے مطابق پاکستان کی حکومت کا فیصلہ کیا ہوگا۔

SPEECHES AND WRITINGS OF MR. JINNAH – VOL-II – P.385

ڈائریکٹ ایکشن

۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل نے اپنے اجلاس بمبئی میں حکومت برطانیہ کیخلاف ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے قائداعظم ؒ نے کونسل سے اپنے خطاب میں کہا۔

ہمارا آج کا فیصلہ ہماری تاریخ کا سب سے یادگار فیصلہ ہے۔ آج تک مسلم لیگ کی پوری تاریخ میں ہم نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ آئینی ذرائع اور آئین کے مطابق کیا۔ لیکن آج ہم موجودہ رخ اختیار کرنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ آج ہم آئینی ذرائع سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔ آج ہم نے بھی ایک پستول سنبھال لیا ہے۔ اور اس قابل ہیں۔ کہ اسے بروئے کار لائیں۔ (الیضاً ۔۔ ص۴۱۹)

غداران قوم کا حشر

ملک کی نئی عبوری حکومت سے مسلم لیگ کے عدم تعاون کی بنا پر اس میں کانگرس کے ساتھ کچھ ایسے مسلمان شامل کر لئے گئے تھے۔ جن کا ملت کی نمائندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے جو روش اختیار کی۔ مذکورہ خطاب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم ؒ نے فرمایا۔

لارڈ پیتھک لارنس نے دارالامرا میں کہا ہے۔ کہ ہم مسٹر جناح سے اس پر اتفاق نہیں کر سکتے۔ کہ انہیں مسلم نامزدگان کی اجارہ داری سونپ دی جائے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کہ وزیر ہند کو موجودہ ذمہ داری کس نے عطا کی۔؟ کیا اسے ہر انگریز کی اجارہ داری حاصل ہے؟ پھر ایسی بے تکی ہانکنے سے فائدہ؟۔ آخر اُسے یہ کیونکر حق حاصل ہے؟ کہ وہ برطانوی عوام کی طرف سے۔ جن کی صرف ساٹھ فیصدی تعداد اس کی حکومت کے پیچھے ہے، کوئی گفتگو کرے۔ ہم اس پر اتفاق نہیں کر سکتے۔ کہ ملت کے ایک غدار (کوئزلنگ) کو ایگزیکٹو کونسل میں کانگرس کی طرف سے نامزد کیا جائے۔ برطانوی حکومت اپنے ہاں خود جان ایمری اور لارڈ ہاہا جیسے غداروں سے کیا سلوک کر چکی ہے؟ کیا انہیں تختۂ دار پر نہیں کھینچ دیا گیا۔ بہت سے انگریز جنہوں نے اپنے ملک سے فریب کیا۔ اور غدار قرار پائے۔ انہیں پھانسی دے دی گئی مجھے بھی یہ منظور نہیں کہ مسلمانوں کے کسی غدار کو ان کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا جائے۔ (الیضاً)

حقیقت پسندی کی اپیل

۵ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو جب وہ وائسرائے ہند لارڈ ویول اور کانگرسی لیڈروں کی معیت میں برصغیر کے مستقبل سے متعلق آخری مذاکرات کے لئے لنڈن روانہ ہوئے۔ تو مجلس اقوام متحدہ میں رائٹر کے سیاسی نمائندے سے ایک انٹرویو کے دوران میں انہوں نے اپنے

نصب العین کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:۔

ہمارا موقف حقیقت پر مبنی ہے۔ ہم نہ صرف اپنے لئے بلکہ ہندوؤں اور ہندوستان کی دیگر اقلیتوں کے لئے بھی آزادی چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنا محبوب نصب العین حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت اس سلسلے میں ایک مضبوط، واضح اور دوٹوک پالیسی بروئے کار نہیں لائی۔ اس سے صورت حال قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اور اس کے نتائج بے حد خطرناک ہوں گے۔ مجھے یقین ہو چکا ہے۔ کہ ہندوستان کے مسئلہ کا واحد حل پاکستان ہے، اور اس کا مفہوم مسلم ہندوستان کی آزادی ہی نہیں، بلکہ ہندو حصّے کی بھی۔ ان حالات کی روشنی میں جو پچھلے چند ماہ میں سامنے آئے۔ مجھے امید ہے۔ کہ حکومت حقیقت پسندی کا ثبوت دے گی۔ اور دوٹوک راستہ اختیار کرے گی۔ کیونکہ اسی کی بدولت ہندوستان اور پاکستان میں مضبوط، اور صحت مند حکومتوں کا قیام عمل میں آسکے گا۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴۹)

برطانوی حکومت کی ذمہ داری

لنڈن میں مذاکرات کے خاتمہ پر قائد اعظمؒ کو کنگز وے ہال میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

میں خوش ہوں۔ کہ برطانوی عوام نے بالآخر نیند سے ذرا آنکھ کھولی ہے۔ برطانوی قوم کا معمول ہے کہ وہ اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب خطرہ سامنے آجائے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کہ مطالبہ پاکستان کے خلاف آخر اعتراض کیا ہے؟ صرف ایک ہی اعتراض کہ ہندو پورا ملک چاہتے ہیں۔ اگر سارا ملک ان کے سپرد کر دیا جائے۔ تو ہماری حیثیت ایک اقلیت سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا برطانیہ اپنی قوت اور سنگینوں کے زور پر ہندو سامراج کی سرپرستی کرنا پسند کرے گا۔ اگر ایسا ہوا۔ تو یاد رکھو کہ تم عزت، راست بازی، اور صداقت شعاری کا آخر نشان تک کھو بیٹھو گے۔ برطانوی حکومت اور برطانوی عوام جس قدر جلد ہندوستان کی حقیقی صورت حال اور حقائق کو سمجھ لیں گے۔ اتنا ہی ان کے لئے بہتر ہوگا۔ نہ صرف ان کے لئے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بھی۔ اس لئے یہ ذمہ داری برطانوی حکومت پر ہے۔ کہ وہ حقائق سے روگردانی اختیار نہ کرے۔ بلکہ مسائل کا مضبوطی اور صفائی سے مقابلہ کرے۔ (ایضاً صفحہ ۹۸)

قائد اعظم انگلستان سے کامیاب و کامران واپس لوٹے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کا اپنے موقف کی صداقت واضح کر دی۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان نقشۂ عالم میں ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ ۱۸ اگست کو اس آزاد مملکت میں عید الفطر کی پہلی تقریب سعید منائی جا رہی تھی چنانچہ اس موقعہ پر

اپنی آزاد قوم کے نام انہوں نے اپنے نشری پیغام میں فرمایا۔

نئی منزل اور نئے تقاضے

"میں بخلوص قلب خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں۔ کہ وہ ہمیں عہد رفتہ کی قابل احترام روایات کا اہل بنائے۔ اور ہمیں اس طاقت سے بہرہ ور فرمائے۔ کہ ہم ملّتِ پاکستان کو صحیح معنوں میں اقوامِ عالم میں ایک ممتاز مقام دلا سکیں۔ لاریب کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔ لیکن یہ منزل ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ آج ہم پر بھاری ذمہ داریاں عاید ہوئی ہیں۔ ہمارے عزائم اور حوصلے اسی قدر بلند ہونے چاہئیں۔ قومی تعمیر کے عملی میدان میں ان کی تکمیل اس سے کہیں زیادہ جدوجہد اور قربانیوں کا مطالبہ کرے گی جس کا تقاضا حصول پاکستان کے مقدس نصب العین کے سلسلے میں ہم سے کیا گیا تھا۔ صحیح معنوں میں ٹھوس عمل کا وقت اب آیا ہے۔ اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ باشعور مسلمان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے اور ان تمام مشکلات و موانعات پر غالب آجائیں گے جو اس راہ میں لاحق ہوں گی۔"

(ایضاً۔ صفحہ ۶)

قومی دفاعی فنڈ

میرے دل کھول کر چندہ دیجئے

عطیہ مندرجہ ذیل کسی بھی جگہ جمع کرایا جا سکتا ہے کسی بھی ڈاکخانہ یا مندرجہ ذیل بنکوں کی کسی ایک شاخ میں جمع کرائیں۔

عطیہ کیسے جمع کرائیں

۱۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان۔ ۲۔ نیشنل بنک آف پاکستان
۳۔ حبیب بنک آف پاکستان ۴۔ کامرس بنک لمیٹڈ۔
۵۔ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ ۶۔ مسلم کمرشل بنک لمیٹڈ
۷۔ سٹینڈرڈ بنک لمیٹڈ ۸۔ آسٹریلیشیا بنک لمیٹڈ
۹۔ ایسٹرن مرکنٹائل بنک لمیٹڈ۔ ۱۰۔ بنک آف بہاول پور۔

نقدی۔ چیک۔ ڈرافٹ۔ پرائز بانڈ۔ سیونگ۔ سرٹیفکیٹ۔ گورنمنٹ سیکورٹیز۔ سونا اور زیورات۔ وغیرہ بطور عطیات مندرجہ بالا کسی بھی جگہ جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

جاری کردہ نیشنل ڈیفنس فنڈ کمیٹی۔ پاکستان

پھر وہی ۔۔۔؟

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

ہم نے طلوعِ اسلام کے اکتوبر کے شمارہ میں لکھا تھا کہ حالیہ جنگ میں ہمارے قابلِ فخر مجاہدوں نے جو محیرالعقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ ان کی پامردی، ہمت، شجاعت، استقامت، جانبازی اور جانفروشی کے زندہ مظاہرے ہیں۔ انہیں غیبی قوتوں کی طرف منسوب کر کے، انہیں افسانے نہ بنائیے۔ اس سے بڑا نقصان ہو گا لیکن انسان کی اعجوبہ پسندی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے چیستاں سرائی اور داستاں گوئی سے ورے تسکین ہی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا تقاضا ہے کہ ان افسانہ تراشیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مثلاً (ہفتہ وار معاصر) چٹان کی ۲۹ نومبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل "مافوق الفطرت واقعات" درج ہیں۔

ایک محاذ پر توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کے بھارتی کینیڈے گولہ باری کر رہے تھے پاکستانی مجاہد جوابی کارروائی میں مصروف تھے کہ ایک سفید ریش بزرگ سادہ دیہاتی لباس میں عین مورچہ پر تشریف لے آتے اور توپچی کو گولہ پھینکنے کے لئے نشان دہی کرنے لگے۔ آپ انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے کہ اس طرف گولہ پھینکا جائے چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق توپ کا زاویہ بدل دیا جاتا۔ اور عجب بات یہ ہے کہ گولہ ٹھیک ٹھیک نشانہ پر لگتا۔ جس کی وجہ سے دشمن کی صفوں میں نہ صرف ابتری پھیل جاتی۔ بلکہ اس کے بھارتی ٹینک اور توپیں بھی برباد و ناکارہ ہو جاتیں۔ اور آخر کار بھارتی سینا پسپائی پر مجبور ہو جاتی۔ ایک دن پاکستانی میجر کو خیال آیا کہ یہ درویش کون ہیں جو روزانہ محاذ پر رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے دن صبح بزرگ موصوف کو خیمہ میں بلا لیا گیا اردلی افسر کا اشارہ پاتے ہی ایستادہ ہو گیا اور سفید ریش بزرگ سے استفسار کیا گیا آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔ درویش بزرگ نے کچھ جواب نہ دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پانی طلب کیا اردلی پانی لینے گیا تو میجر کرسی پر بیٹھنے کے لئے بڑھا،

جونہی توجہ دوسری طرف مبذول ہوئی تو میجر نے دیکھا وہ کرسی خالی پڑی ہے جس پر بزرگ تشریف فرما تھے۔ میجر اور تمام لوگ حیران تھے کہ یہ کیا کرشمہ ہے تلاش بسیار کے بعد بھی وہ بزرگ پھر اس محاذ پر نظر نہ آسکے۔

پھر تحریر ہے۔

ایک عزیز دوست شرقپور سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ کے دنوں ایک رات مجھے حضرت میاں شیر محمدؒ صاحب کی خواب میں زیارت ہوئی تو آپ کا لباس گرد آلود اور ہاتھ قدرے میلے تھے میں نے پوچھا حضرت اس وقت کونسی مصروفیت ہے تو آپ نے اشارۃً فرمایا کہ محاذ جہاد جاری ہے اور مجاہدین کی اعانت فرض ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے۔

ایک صاحب قصور کے رہنے والے ہیں اور ہر ہفتہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے ہیں وہ ایک دن حسب معمول مزار پر حاضر ہوئے تو کوشش بسیار کے باوجود صاحب مزار سے کوئی توجہ نہ مل سکی۔ اسی پس و پیش کے عالم میں انہوں نے تین دن تک وہیں قیام کیا آخری رات چند لمحات کے لئے زیارت ہوئی تو حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا کہ محاذ پر مصروف تھا سرکار دو جہاںؐ کے فرمان کے مطابق تمام بزرگان دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے جہاد کا حکم دے دیا گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ۔

روزنامہ حریت کراچی اور مشرق لاہور مدینہ منورہ سے ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مکتوب نگار کو آنحضرتؐ کی زیارت ہوئی تو سرور کونینؐ حرم نبوی کے باب السلام میں بڑی عجلت میں پا برکاب ہیں آپ کے جلو میں صحابہؓ کرام کا قافلہ بھی ہے۔ رسالتمآب فرما رہے تھے کہ پاکستان پر کفار نے حملہ کر دیا ہے اس لئے جہاد فرض ہو گیا اور سواری بڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔

اور اسی ردیف میں یہ بھی کہ

حکیم منیر اسلمی لاہور جنگ کے دنوں وطن عزیز سے باہر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد جب زیارت روضۂ اطہر کے لئے مدینہ منورہ پہنچا۔ تو وہاں کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبدالغفور مہاجر مدنی نے دوران ملاقات فرمایا کہ ایک رات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں ملاقات ہوئی میں نے عرض کیا آپ نجف شریف سے کیسے تشریف لے آئے تو فرمایا پاکستان پر کفار حملہ آور ہیں اس لئے وہاں جہاد میں شرکت کیلئے جا رہا ہوں۔

اس کے بعد ایک خانیہ بیان درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور کی ایک جامعہ مسجد کے خطیب نے منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر خانیہ بیان کیا کہ بھارتی فوجیوں اور ہوابازوں کو جب پاکستان کی بہادر فوجوں نے گرفتار کیا تو وہ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ پاکستان کے وہ سبز پوش مجاہد کہاں ہیں

کہ ہم سخت سے حملہ کرتے تھے۔ لیکن وہ سبز پوش بڑے اطمینان سے ہمارے حملہ کو ناکارہ بنا دیتے اور ہمیں پسپائی پر مجبور کر دیتے،

اور انتہا یہ ہے کہ بھارتی ہوا باز پاکستان کے ایک معروف شہر پر تقریباً سو بم گراتے ہیں لیکن ان کے فضل سے اس شہر کے ہوائی اڈے کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا تو یہ اللہ کی رحمت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان "واقعات و مشاہدات" کو درج کرنے کے بعد، صاحب مضمون رقمطراز ہیں:-

> الغرض ایسے لاتعداد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ خود اللہ تعالیٰ نے لڑی ہے۔ اور خالقِ کون و مکان کے محبوب پیغمبرؐ سرورِ کائناتؐ کے فیض و برکت سے فتح پذیر ہوئی ہے۔

ہم ان حضرات سے باادب دریافت کرنے کی جرأت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مخالف یہ اعتراض کر دے کہ

> آپ کے عقیدہ کے مطابق یہ جنگ خود اللہ تعالیٰ نے لڑی ہے۔ اس میں حضور نبی اکرمؐ۔ حضرت علیؓ۔ داتا گنج بخشؒ۔ میاں شیر محمد شرقپوریؒ۔ اور دیگر اولیاء کرام۔ بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ اور سرکار دو جہاںؐ کے فرمان کے مطابق تمام بزرگانِ دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے۔
>
> تو پھر یہ کیوں ہوا کہ قصور پر بمباری ہوئی اور وہاں کی بے گناہ بستی آبادی تباہ و برباد ہو گئی۔ پشاور کے گرد و نواح کے دیہات دشمن کی گولہ باری کا نشانہ بن گئے۔ مریدکے اور نارنگ کے قریب چلتی ٹرینوں کے مسافر بچارے بم سے اڑ گئے۔ اعوان شریف پر دشمن کے گولوں نے آگ برسادی اور کتنا ہی نقصان ہو گیا۔ سیالکوٹ میں گولہ باری نے تباہی مچا دی۔ سلیمانپور کی بستی گولوں کا نشانہ بن گئی۔ لاہور اور سیالکوٹ سیکٹر میں سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہمارا کتنا ہی علاقہ دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔

تو آپ کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟ جو جنگ خود خدا لڑے کیا اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے؟ اور آگے بڑھئے۔ پاکستان نے یہ جنگ کشمیر کے مظلوموں کی حفاظت اور ان کے جائز حقوق کے استرداد کے لئے لڑی تھی۔ لیکن خود کشمیر میں دشمن نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اور جس طرح معصوم بچوں۔ بے گناہ عورتوں۔ مظلوم بوڑھوں۔ نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل ہی نہیں کیا جا رہا بلکہ انہیں زندہ جلایا جا رہا ہے۔ گاؤں کے

گاؤں نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی بے محابا عصمت دری کی جا رہی ہے۔ جو قتل ہونے سے بچ جاتے ہیں انہیں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔۔۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ ذرا سوچئے کہ یہ اعتراض بڑی گہری سوچ کا متقاضی ہے۔

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ

> بعض غزواتِ اسلامیہ میں صحابہ کبارؓ نے رسول اللہؐ سے سوال کیا کہ میدانِ جنگ میں ایسے مجاہد بھی برسرِ پیکار نظر آتے ہیں جنہیں ہم پہچان نہیں سکتے۔ تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ آسمانی مخلوق ملائکہ مقربین تھے جو مسلمانوں کی طرف سے کفار کے ساتھ نبرد آزما تھے۔

لیکن قرآن کریم نے جہاں ان ملائکہ کا ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی تصریح کر دی ہے کہ لَمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶ ؛ ۹/۴۰ ؛ ۳۳/۹)۔ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے (اس لئے کہ ان کا مشن لِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ - ۳/۱۲۵ - دلوں کو اطمینان بخشنا تھا)۔ قرآن کریم کی اس تصریح سے واضح ہے کہ یہ روایت جو اوپر درج کی گئی ہے (کہ صحابہؓ نے ان ملائکہ کو دیکھا تھا) صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ قرآن مجید کے بیان سے ٹکراتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر ہماری حالیہ جنگ میں "ملائکہ کا نزول" ہوا بھی تھا تو وہ کسی کو نظر نہیں آسکتے تھے۔ لہٰذا، وہ تمام "مشاہدات" جن میں کہا گیا ہے کہ لوگوں نے ان مافوق الفطرت قوتوں کو انسانی پیکروں میں دیکھا، ذہنِ انسانی کے تخیلات سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتے۔

ان افسانوں کا جو حوصلہ شکن اثر ہمارے جواں ہمت مجاہدوں پر پڑ رہا ہے اس کا ذکر اسی اشاعت میں) دوسری جگہ کیا گیا ہے۔ بنا بریں ہم تمام متعلقہ حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ ہمارے ان جانفروش مجاہدوں کے کارناموں کو افسانے نہ بننے دیں اور انہوں نے جو معرکے سر انجام دیئے ہیں ان کا سہرا انہی کے سر باندھیں۔ جہاں تک تائیدِ خداوندی کا تعلق ہے، اس کا صحیح قرآنی مفہوم ہم اس سے پہلے بالوضاحت لکھ چکے ہیں۔

پاک بھارت حالیہ جنگ کے ایام کا ولولہ انگیز ریڈیو پروگرام

ندائے حق

خوبصورت کتابی شکل میں۔ عمدہ سفید کاغذ اور آفسٹ پر دیدہ زیب طباعت۔ قیمت ۔۔۔ چھ روپے

کلاسیک ۴۲ - دی مال - لاہور سے طلب فرمائیں۔

پاکستان کی نئی "زیارت گاہیں"

(پرویز)

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء کی شام، جبکہ سورج کی، خونِ شفق میں ڈوبی ہوئی کرنیں، واہگہ کے لالہ زار کو الوداعی سلام کہہ کر رخصت ہو رہی تھیں، میں، چند احباب کی معیت میں باٹا پور فیکٹری سے باہر، نہر کے کنارے کھڑا تھا۔ سامنے، نہر کے پل کی شکستہ سلیں پانی میں سرنگوں تھیں اور پانی اپنی دانست سے بے پرواہ نہایت خاموشی سے آگے بڑھے جا رہا تھا۔ اسے اس کا بھی علم و احساس نہیں تھا کہ وہ کس طرح پاکستان کی تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکا ہے —— اشیائے فطرت کی کیفیت ہی یہ ہے کہ وہ اکثر اوقات انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں لیکن اس کا (CREDIT) خود نہیں لیتیں۔ ان کے برعکس یہ حضرت انسان ہے جس کی حالت یہ ہے کہ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (۳/۱۸۸)۔ یہ ان کاموں کے لئے بھی اپنی تعریف چاہتا ہے جنہیں اس نے سرانجام نہیں دیا ہوتا —— میں اس نہر کے کنارے خاموش کھڑا تھا۔ اور میرے پردۂ تصور پر ماضی کے نقوش ایک رنگین فلم کی طرح ابھرتے چلے آ رہے تھے —— اکثر ایسا ہوا کہ اتوار کے دن، درس کے بعد ہم نہر باری دوآب کے کنارے کنارے، سیدھے واہگہ کی سرحد تک چلے گئے۔ راستہ میں یہ بڑی نہر (لنک کینال) بھی پڑتی تھی۔ اُس وقت یہ بات کبھی حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئی تھی کہ یہ نہر جسے ہم محض حسنِ مناظر کی جولانگاہ سمجھ رہے ہیں، ایک دن پاکستان کا باب السلام، ہماری ہر متاعِ حیات کی محافظ و پاسبان، سرزمینِ لاہور کے لئے حصنِ حصین اور جسدِ ملت کی رگِ حیات بن جائے گی۔ پھر میرے سامنے ۱۴ اگست کی دوپہر کا وہ منظر بھی تھا جب

واہگہ کی سرحد پر، رن آف کچھ کے ہنگامہ کے بعد، ہندوستان اور پاکستان کے قیدیوں کے تبادلہ کی ایک غیر رسمی لیکن نہایت مؤثر اور عبرت آگیں تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اور جب ہمارے ایک قیدی کے بدلہ میں، ہماری طرف سے ہندوستان کے سات قیدی چھوڑے جاتے تھے تو اس وقت ہمارے دلوں میں پاکستان کی عظمت و برتری کا احساس کس قدر گرم جوشی پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے کسٹم کالونی کی حسین اور مصفا عمارت تھی جہاں مشروبات سے ہماری نہایت بے تکلفانہ تواضع ہوئی تھی۔ پھر میرے سامنے وہ منظر آیا جب، ۸ ستمبر سے ایک ہی ہفتہ پہلے، ہم ستلج رینجرز کے کمانڈر، میجر علیم کی دعوت پر شام کے وقت جھنڈے اتارنے کی خاموش اور پُر وقار تقریب دیکھنے کے لئے سرحد کے پھاٹک تک گئے تھے ـــــ خلوص اور محبت کا پیکر میجر علیم ایک باغ و بہار شخصیت! واپسی پر رات ہو گئی تو جلو موڑ کی دو رویہ دوکانیں جہاں پہلے آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا، جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سب کچھ میری نگاہوں کو دامانِ باغبان و کفِ گل فروش بنا رہا تھا کہ یکایک اس فلم کا دوسرا سین سامنے آ گیا۔ نہر کے اُس پار، جلو موڑ کی ساری آبادی ویرانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تا بحدِ نگاہ ہیبتناک خاموشی اور قبرستان کا سا سکوت تھا۔ انسان تو ایک طرف، کوئی چرند و پرند بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حسین و شاندار کسٹم کالونی ویران ہو چکی تھی۔

.. .. نہر سے اِس طرف چند قدموں تک لیکن اُس پار، دور دور تک کھنڈرات ہی کھنڈرات دکھائی دے رہے تھے ـــــ میجر علیم اور ان کے ساتھیوں کے متعلق مختلف قیاسات تھے۔ انہوں نے جس جانبازانہ ہمت اور مجاہدانہ شجاعت سے، بھارتی فوج کے اچانک شبخون کو نہار دکا تھا، اس کے متعلق بجتہ خبریں وجہ نشاطِ روح ہو رہی تھیں۔

لیکن اس کے بعد ان پر کیا گذری، اس کے متعلق کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ حیاتِ جاوداں کی ہزار عشرت سامانیاں اپنے جلو میں لئے فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۴/۵۵)۔ شادکام و کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں ـــــ وہ جہاں بھی ہیں، خدائے ذوالمنن کے سحابِ کرم کی لا انتہا بارشیں ان پر گہر باری کریں۔

میں انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ہمارے مورچوں کے قریب، ایک جوانِ رعنا، میجر کی پُرشکوہ وردی میں ملبوس، کڑی کمان کے تیر کی طرح آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ چہرہ نہایت شگفتہ و شاداب۔ ایسے افسردہ و پژمردہ ماحول میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے صحرا میں لالہ کا پھول کھلا ہو۔ پاس سے گذرا تو ہمارے ساتھ کھڑے میجر .. .. کو دوستانہ سلام کرتا آگے

بڑھ گیا۔ لیکن چند قدم جانے کے بعد لوٹا اور آکر ہم سب سے نہایت محبت اور خلوص سے ملا۔ کہا کہ معاف فرمائیے! سامنے جھاڑی کی ایک جنبش نے میری توجہ کو اس قدر جذب کر رکھا تھا کہ میں رک نہ سکا۔ اب اطمینان کے بعد واپس آیا ہوں۔ باتیں تو چند ہی کیں لیکن انہی سے اس کا حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار آئینے کی طرح سامنے آگیا۔ اقبال کے تصور کا ایک جیتا جاگتا مرقع کہ

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ ضربِ کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر — اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

اتنے میں مجھے نہر کے اُس پار، کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ یہ تین سکھ سپاہی تھے جو ریت کی خود ساختہ دیوار کے پیچھے بھارت کے ترنگے جھنڈے کو سنبھالے کھڑے تھے۔ میں نے میجر صاحب سے پوچھا کہ یہ اتنے قریب ہیں کبھی کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے۔ میں نے دیکھا کہ یہ سُن کر اس جیالے سپاہی کی آنکھوں میں خون اتر آیا — کہنے لگا۔ پرویز صاحب! آپ بدتمیزی کہتے ہیں؟ اگر یہ کبھی ہماری طرف میلی نگاہ سے بھی دیکھیں تو خدا کی قسم یہیں کھڑے کھڑے ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ مفتوحہ علاقہ پر اپنا جھنڈا گاڑے کھڑے ہیں۔ اس احساس سے سپاہی کا سر آسمان کو چھو جانا چاہیئے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ وہ کس قدر افسردہ و پژمردہ کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کسی نے شیر کے سامنے بکری باندھ رکھی ہو۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ محض فائر بندی کی ڈھال ہے جس کے پیچھے انہیں سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔ ورنہ زندگی ان کے نصیب میں کہاں؟ — وہ یہ کہہ رہے تھے اور مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کہیں ابھی بندوق کی لبلبی نہ دبا دیں۔

اتنے میں میرے احباب نے کہا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔ ہم نے رخصت چاہی تو اس ایئر یا کے کمانڈر نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ چائے کا پیالہ پیئے بغیر کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ ہم نے ہزار معذرت چاہی لیکن سپاہی کے آگے کس کی پیش جا سکتی ہے؟ باٹا کمپنی کے اندر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ وہاں زبردستی لے گئے۔ دروازے کے باہر ایک مگر مچھ نما بم پڑا تھا۔ کہنے لگے، اس سے ذرا ہٹ کر آیئے گا۔ یہ دشمن کا "اَن پھٹا" بم ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر آگیا کہ

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

انہوں نے اس ویرانے میں، ایسی بے سروسامانی کے عالم میں، بڑی محبت سے چائے پلائی۔ چائے کے دوران گفتگو میں نہر کے پل کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے کہ اس کی داستان بڑی لرزہ انگیز اور ساتھ ہی حوصلہ افزا ہے —

۷ ستمبر کو صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب دشمن اس پُل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیچھے امرتسر تک سپاہ کا ایک سیلاب بلا انگیز ٹھاٹیں مارتا آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ان کے جلو میں تھا۔ ان کے اور پاکستان کے درمیان یہی ایک پل تھا۔ عام لوگوں کو یہی معلوم ہے کہ ہم نے اس پل کو فوراً توڑ دیا اور یوں لاہور محفوظ ہو گیا۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ پل شام کے ساڑھے چار بجے تک نہیں ٹوٹا تھا، ایک مرتبہ کوشش کی تو اس میں صرف دراڑیں پڑیں۔ آپ سوچئے کہ یہ وقت کس قدر نازک تھا۔ اس ذرا سے ٹکڑے پر مسلسل دس گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ ہمارے دلوں میں یہ احساس قیامت برپا کر رہا تھا کہ اگر ایک دفعہ دشمن نے اس پل کو عبور کر لیا تو پھر اس کا مسمار کرنا شاید ناممکن ہو جائے۔ اور اس کے بعد جو کچھ لاہور پر گزر سکتی تھی اس کے تصور سے بھی آج روح کانپتی ہے۔ اس احساس نے پل کے اس طرف جانبازوں کی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی۔ اور اس دیوار نے دشمن کے سیلاب بے پناہ کے روکنے میں جو کچھ کر دیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ کے اوراق پیش کر سکیں۔ مسلسل دس گھنٹے تک یہ صبر آزما کشمکش جاری رہی۔ تا آنکہ، ہمارے قابلِ صد افتخار، جانباز سپاہی، میجر آفتاب[۱] نے، واقعی ہتھیلی پر سر رکھ کر اسے توڑ ڈالا۔ فوج نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور دشمن خاسر و نامراد، منہ تکتا رہ گیا۔ یہ ہے وہ پل جس کی ٹوٹی ہوئی سلوں پر ان سرفروشوں کی داستانِ عظمت، انمٹ حروف میں نقش ہو چکی ہے۔ اولٰئک علیھم صلوٰت من ربھم و رحمۃ و اولٰئک ھم المفلحون (۲/۱۵۷)۔

ہم باہر نکلے تو معلوم کیوں۔ ترنگے جھنڈے پر میری نگاہ بلاشعور جا پڑی — پاکستان کی سرزمین پر بھارت کا جھنڈا! — دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت — میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ کمانڈر نے دیکھا تو میرے مونڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ مت گھبرایئے۔ چند دنوں تک اسے برداشت کر لیجئے۔ جس دن فائر بندی کا حکم واپس لیا گیا اس دن آیئے گا اور پھر دیکھئے گا کہ اس جھنڈے کی دھجیاں کس طرح فضا میں اڑ رہی ہیں — اور اتنے میں، میں مشورہ دوں گا کہ آپ کھیم کرن ہو آیئے۔ تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی آپ کے سامنے آجائے۔

کھیم کرن

چنانچہ ۲۱ راکتوبر کی شام ہم کھیم کرن کے محاذ کی طرف گئے۔ قصور سے جب شاہراہ چھوڑ کر ہم کھیم کرن کی

---

[۱] میجر آفتاب: ہمارے ایک مرحوم دوست کے قابلِ فخر خلف الرشید ہیں۔ اور اب تو پوری ملت کے لئے باعث صد افتخار ہیں۔ ویسے بھی وہ گلبرگ میں ہمارے قرب میں رہتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

طرف مڑے ہیں تو سب سے پہلے پھر اُسی نہر کو سلامی دی جسے میں نے ابھی ابھی پاسبانِ پاکستان اور بابُ الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ نہر کو پار کیا تو سامنے ایک وسیع و عریض میدان تھا جس میں بھارت کے شکستہ ٹینک یوں بکھرے پڑے تھے جیسے ڈھور ڈنگروں کے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوں۔ اس سے یہ نظر آیا کہ دشمن ایک وقت میں یہاں تک بڑھ آیا تھا۔ تھوڑی دور آگے گئے تو پاکستان کی سرحد ختم ہوگئی اور اب ہمارے قدم اُس سرزمین پہ تھے جسے ہم نے بھارت سے فتح کر کے حاصل کیا ہے۔

اس مقام پر یک لخت، اٹھارہ سال پہلے کا ایک ایسا واقعہ ابھر کر شعور کی سطح پہ آگیا جو اس سے پہلے کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت، جب میرا دہلی سے روانہ ہونے کا دن آیا، تو دفتر کے ہم عصر ہندوؤں نے مجھے الوداعی پارٹی دی تھی۔ یہ قوم بھی عجیب وغریب واقع ہوئی ہے۔ یہ مجھے پس پشت "اورنگا"، (اورنگ زیب کا کھاشاہی حقارت آمیز تلفظ) کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی پارٹیاں بھی دیا کرتے تھے۔ اور پھر پارٹی بھی ہندوستان کو چھوڑتے وقت۔ یا للعجب! پارٹی کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو ان میں سے ایک بے تکلف ہمکار نے کہا کہ "چودھری صاحب! پھر دہلی کب آؤ گے" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "جب دہلی فتح کرلیں گے"۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے اس اٹھارہ برس میں سرزمینِ ہند پر قدم تک نہیں رکھا۔ اور آج پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین کے اس رقبے پر قدم رکھا جسے ہم نے فتح کیا ہے۔ یہ واقعہ یاد آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے پاؤں کے تلوے سے ایک لہر اٹھی ہے اور برقِ تپاں بن کر رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ جذبۂ تشکر سے میرا سرِ نیاز بدرگاہِ رب العزت جھک گیا۔

اب راستے میں رکنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لئے تیزی سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کھیم کرن کے سامنے تھے۔ ہمارے سامنے کھیم کرن نہیں تھا۔ عبرت و موعظت کی ہزار داستانوں کا مرقع تھا۔ ایک ایسی بستی جو ابھی چند دن پہلے پندرہ بیس ہزار ... نفوس کا جیتا جاگتا مسکن تھی، اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کا کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس پر چھت موجود ہو۔ کوئی دیوار ایسی نہیں تھی جو صحیح و سالم کھڑی ہو۔ کوئی دروازہ یا دریچہ ایسا نہ تھا جو جل کر کوئلہ نہ ہوگیا ہو۔ وہاں وحشت ہی نہیں دہشت کا کیا عالم تھا، آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ ساری بستی میں کوئی ایک سانس لینے والا بھی نہیں تھا۔ بڑا ہی ڈراؤنا منظر تھا۔ اکثر مکانات پرانے زمانے کی چھوٹی اینٹوں کے قلعہ نما محل تھے جس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ قصبہ قدیم زمانے سے آباد چلا آرہا تھا۔ لیکن اب اس کے کھنڈرات کی ایک ایک اینٹ پر یہ منقوش تھا کہ

فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ
عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ ○ (۲۲/۴۵)۔

کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ کردیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے ظالم تھے۔

ان میں اب کوئی بھی نہیں بستا۔ وہ اس طرح اجڑی ہوئی ویران پڑی ہیں کہ ان کے کنوئیں بیکار ہو چکے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مستحکم قلعے اور محلات کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

اس لئے فاعتبروا یا اولو الالباب۔

کھیم کرن سے دو تین میل اور آگے بڑھے تو اس مقام تک پہنچ کر رک گئے جہاں سے آگے جانا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ تھوڑی دور آگے ہندوستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہاں سے ہماری سرحد سامنے نظر آ رہی تھی۔ اِدھر ہمارے سپاہی اُن کے سامنے دو گز کے فاصلے پر دشمن کی فوج کا دستہ۔ درمیان میں کوئی حفاظتی دیوار نہیں!

اس مقام پر ایک نوجوان کمانڈر تھا — غالباً صوبیدار — وہ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا کہ وہ ۶ ستمبر کی صبح اس محاذ پر آ گیا تھا۔ ساری جنگ لڑی۔ دشمن کو دھکیلتا ہوا یہاں تک لے آیا۔ اور اُس دن کے بعد اس وقت تک یہیں مقیم ہوں۔ اس محاذ کی داستان بیان کرنے والا اس سے زیادہ ثقہ راوی اور کون ہو سکتا تھا۔ اُس نے چشم دید واقعات سنائے — وہ واقعات سنا رہا تھا اور ہم دم بخود ساکت و صامت کھڑے دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ! اب بھی تیرے بندوں میں ایسے جری اور بے باک موجود ہیں جو اس ستم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ یقیناً اسی آدم کی اولاد ہیں جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز تھے۔

میں نے اس سے کہا کہ صوبیدار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ ۶ ستمبر کی صبح سے ۸ کی شام تک مسلسل لڑتے رہے۔ اس دوران میں کھانے پینے کا کیا رہا؟ یہ سن کر اس نے میری طرف عجیب حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر صرف اتنا کہا کہ میاں صاحب! کھانا پینا بیکار وقت کا مشغلہ ہے۔ کام میں اس کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ چنوں کی پوٹلیا میرے پاس تھی۔ تین دن تک... بندھی کی بندھی رہ گئی۔

نہ کسی نے لی نہ کسی نے دی جو بھری تھی خم میں بھری رہی

میں نے کہا کہ ہمارے (وہ) اگلے سپاہی، دشمن کے سپاہیوں سے دو ہی قدم کے فاصلے پر ہیں۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ وہ کوئی شرارت تو نہیں کرتے؟ — کہنے لگا کہ ہاں! وہ ان سے چھ گنا زیادہ ہیں۔ لیکن صاحب! ہماری قسمت کہاں کہ وہ کوئی شرارت کریں۔ ان کمبختوں سے تو غلطی سے بھی کوئی فائر نہیں ہوتا۔ ہم تو تنگ آ گئے۔ آپ ہی سوچئے۔ کب تک کوئی لبلبی پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے!

اس میدان میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ فضا پر وحشت طاری تھی۔ یہ حالت دن میں تھی۔ رات کو یہاں

کس قدر خوفناک تاریکی ہوگی - اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے — میں نے کہا — صوبیدار صاحب! آپ لوگوں کو تنہائی نہیں ستاتی - یہ سن کر اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسی آواز سے جس میں اعتماد کی پوری قوت جھلک رہی تھی، کہا کہ تنہائی! یہ آپ نے کیا کہا - ہم تنہا نہیں ہیں - ہمارے ساتھ دس کروڑ پاکستانیوں کی دعائیں ہوتی ہیں - یہ ہمیں نہ کبھی اداس ہونے دیتی ہیں نہ مایوس - ہم کبھی تنہا نہیں ہوتے - آپ سب بھائی ہمارے ساتھ ہوتے ہیں — ہم تو جیتے ہی آپ کے سہارے ہیں -

وہ یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے - میں نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا - اس کے ہاتھ چومے - لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا - میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں - ان میں خوشی کے آنسو تھے -

شام ہو رہی تھی - ہم نے بچوں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے وہاں سے کچھ تحائف اکٹھے کئے — ٹوٹے ہوئے ٹینکوں کے ٹکڑے - چلے ہوئے کارتوس — توپ کے گولوں کے خول — ان سے بڑھ کر اور کیا تحائف ہو سکتے تھے!

راستے میں شام ہو گئی تو سڑک کے کنارے کچھ سپاہی کھانا لے کر بیٹھے تھے - ہم نے سلام کیا تو وہ ہمیں گھیر کر کھڑے ہو گئے کہ صاحب! کھانا کھا کر جائیے - ہم نے بڑی معذرت کی اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے - ہم ابھی گھر پہنچ جائیں گے - آپ جنگل میں ہیں - آپ کھانا کھائیے - لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے - کھانا الگ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب تک آپ شریک نہیں ہوں گے ہم نہیں کھائیں گے - اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو -

اس کے کیا معنی کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو -

اس ان پڑھ سپاہی نے نہایت سادگی سے یہ الفاظ کہے اور نہ معلوم مجھے کہاں سے کہاں لے گیا - میں نے جی میں کہا کہ اے کاش! یہ بات کہیں ہماری سمجھ میں آجائے تو آج ہی دنیا کی تاریخ کچھ سے کچھ ہو جائے - اسلام یہی تو کہنے آیا تھا کہ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ ایک شخص کھا رہا ہو اور دوسرا سامنے کھڑا دیکھ رہا ہو!

سپاہی مصر تھے - ہم حیران - کہ ان کے کمانڈر نے مفاہمت کی راہ نکالی اور ہم سے کہا کہ صاحب! آپ ایک ایک لقمہ لے لیجئے - یہ اس کے بغیر نہیں کھائیں گے -

وہ ایک لقمہ میرے لئے حاصلِ زیست تھا — ایک مردِ مجاہد سے ہم نوالہ ہونے کی سعادت —

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

چونڈہ

جنگ کے ان محاذوں کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک میدانِ کارزار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا جائے اس امر کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے جانفروش مجاہدوں نے کس قسم کے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس جنگ میں سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جو بے پناہ مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور ہمارے کوہ پیکر نوجوانوں نے جس بے جگری اور سرفروشی سے اس کا مقابلہ کیا تھا، اس کی داستانوں کی گونج مدت تک سنائی دیتی رہے گی۔ اس لئے اس محاذ کو دیکھنے کو بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن محاذ پر جانے کا فائدہ اسی صورت میں ہے کہ... کوئی فوجی افسر ساتھ ہو۔۔۔ کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا۔۔۔ ہماری خوش بختی ہے، اس محاذ پر ہمارے دو قرآنی دوست تعینات تھے۔ ان کے حسنِ توسط سے ہماری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی۔ ۲۰ نومبر کی صبح ہم اس محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ڈسکہ کے مقام پر، ایک قرآنی رفیق ملک ضیاء اللہ صاحب کا مکان سڑک کے کنارے واقع تھا۔ انہوں نے زرہِ حسن تواضع، ناشتہ کیلئے روک لیا۔ تنہا، ناشتہ کی کشش تو شاید ہمارے لئے عناں گیر نہ ہوتی لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی بچیوں نے جس معصومانہ انداز سے ہمارا پرتپاک استقبال کیا، اس نے نہ صرف یہ کہ ہمیں آگے بڑھنے نہ دیا بلکہ ہم وہاں کافی دیر تک رکے رہے کس قدر خوش بخت ہے وہ گھرانا جس کی فضا قرآنی فکر سے معمور ہو۔

طے یہ تھا کہ ہمیں پسرور کے ریلوے اسٹیشن پر، فوجی راہ نما مل جائیں گے تاکہ ہم بآسانی آگے جا سکیں۔ ڈسکہ میں جو ہمیں کچھ دیر ہوگئی تو ہم نے دیکھا کہ ان راہ نماؤں کی جیپ پسرور سے ڈسکہ کی طرف چلی آرہی ہے۔۔۔ اور جیپ میں سپاہی نہیں تھے۔۔۔ خود ہمارے معزز میزبان تھے۔ اس گرمجوشی سے ملے کہ ان کے سینے کی حرارت نے ہمارے عروقِ جامد میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ کس قدر صحیح کہا تھا حکیم الامت نے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہاں سے ہم سیدھے چونڈہ گئے۔۔۔ جسے سیالکوٹ کی ٹینکوں کی جنگ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت چونڈہ کے میدان میں لڑی گئی تھی۔۔۔ ہمارے قومی ترانوں میں چونڈہ کا نام ضرور آنا چاہئے تھا۔۔۔ قصبہ بے آباد تھا۔ اس کے باہر ایک ٹیلہ پر چڑھے تو سامنے وہ وسیع وعریض میدان تھا جس میں یہ محیر العقول اور عدیم النظیر معرکہ سر ہوا تھا۔ جموں کے اطراف سے نیچے اتریئے تو سامنے میلوں لمبا چوڑا میدان ہے۔۔۔ بالکل ہموار۔۔۔ نہ کوئی ٹیلہ نہ چٹان۔ نہ ندی نہ نالہ۔ حتیٰ کہ درخت بھی کہیں کہیں اکادکا کھڑے ہیں۔ اس قسم کا میدان ٹینکوں کی لڑائی کے لئے بڑا سازگار ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ دشمن نے اس یورش کے لئے اسی

میدان کو منتخب کیا تھا۔ وہ پہلے ہلہ میں چونڈہ تک پہنچ چکا تھا — شہر اور ریلوے اسٹیشن اس کے قبضہ میں تھا — کہ ہمارے جانباز وہاں پہنچ گئے۔ اور انہوں نے پھر جو کچھ کر کے دکھایا، آسمان کی آنکھوں نے کا ہیکو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہوگا۔ تعداد میں کہیں کم۔ ساز و یراق کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسرے محاذوں پر لڑنے کے بعد یہاں پہنچے ہوئے — تھکے ماندے — لیکن عقاب کی نگاہیں اور چیتے کا جگر لئے ہوئے۔ خدا کی اس صفت کے مظہر کہ — لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵)۔ نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند — ہمارے دونوں میزبان دوست (جو اعلیٰ افسر ہیں)۔ شمشیر بکف اور کفن بدوش اس محاذ کے اندر تھے۔ انہوں نے ایک ایک مورچہ پر پہنچکر جو "آپ بیتی" سنائی ہے تو باور کیجئے، ہمیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اس "آپ بیتی" میں اپنے کارناموں کا ذکر محض بر سبیل تذکرہ، اور وہ بھی انتہائی انکسار کے ساتھ۔ سارا (CREDIT) اپنے رفقاء کو دیتے ہوئے — اور رفقاء کا یہ عالم کہ وہ رہ رہ کر ہمارے کانوں میں کہتے چلے جاتے تھے کہ یہ سب کچھ انہوں نے خود کیا تھا، ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ کیسی حسین و دلکش تفسیر تھی یہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ کی (کہ مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ ہماری فوجوں نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے، آپ کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس کے وجوہ و علل تو بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک عنصر ایسا ہے جو میرے نزدیک بڑا اہم ہے۔ لڑائی کا عام نقشہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے آگے پیدل سپاہی ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے چھوٹے افسر۔ جوں جوں پیچھے ہٹتے جائیے، افسروں کا درجہ بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً سب سے آگے کیپٹن۔ اس سے پیچھے میجر۔ پھر کرنیل۔ پھر بریگیڈیر۔ حتیٰ کہ جرنیل کا مورچہ یا ہیڈ کوارٹر، محاذ جنگ سے میلوں پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ دشمن کے مقابلہ میں ہماری تعداد بہت کم ہے۔ ہم نے لڑائی کا نقشہ الٹ دیا۔ ہم نے افسر اور سپاہی کا امتیاز اٹھا دیا۔ چنانچہ افسر اگلی صفوں میں سپاہیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے۔ ہمارے سپاہیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک زخمی افسر کو بچانے، حتیٰ کہ ایک افسر کی لاش کو دشمن کے قبضے سے چھڑانے کے لئے، بیسیوں سپاہی اپنی جان دیدیتے ہیں۔ ان سپاہیوں نے جب دیکھا کہ افسر خود ان کے ساتھ شانہ بشانہ لڑ رہے ہیں تو انہوں نے، ان سے بھی آگے بڑھ کر موت کو گلے لگایا۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے افسروں کی اموات (شہادت) کی نسبت اس قدر زیادہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے۔ اور یہی وجہ درحقیقت ہماری اس قدر حیرت انگیز کامیابیوں کی ہے۔

ہمارا دوست یہ کچھ بیان کر رہا تھا اور میرے سامنے قرآن کریم کے اس مقام کے رموز و اسرار ایک

ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے جہاں اس نے کہا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۳۳/۲۱)۔ جنگ احزاب میں، مسلمان فوج پر (قرآن کے الفاظ میں) "ایسا سختی کا وقت آگیا کہ دشمن کے لشکر چاروں طرف سے امنڈ کر آگئے تھے۔ خوف کے مارے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا' اور دہشت سے ان کے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اچھل کر حلق تک آ پہنچیں گے"۔ ایسے حوصلہ شکن اور ہمت طلب حالات میں، ان کا کمانڈر (یعنی حضور نبی اکرمؐ) بنفس نفیس ان کے شانہ بشانہ چٹان کی طرح کھڑا تھا اور دشمن کی یلغار کی تلاطم انگیزیاں اس کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ یہ تھا وہ مقام جہاں ان مجاہدوں سے کہا گیا کہ

کس قدر حسین تھا وہ نمونہ جو تمہارے رسول نے تمہارے لئے پیش کیا تھا۔

اور حضور رسالتمآبؐ کے اسی اسوۂ حسنہ کا اتباع تھا جس نے ہماری حالیہ جنگ میں لڑائی کا نقشہ الٹ دیا تھا — میں یہ کہہ رہا تھا اور میرے دوست کے چہرے پر مسرتوں کی سرخی پھیل رہی تھی۔ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر باعث مسرت و امتنان اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کا قدم، حضور رسالتمآبؐ کے اتباع میں اٹھا اور اس کا ایسا خوشگوار نتیجہ سامنے آیا — میرے دوست نے فخر و مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا کہ "آپ نے آج کس طرح ہماری نگاہوں کا رُخ پھیر دیا ہے۔ میرے رفقائے ہم عنان کو اُن کے اقدام کی اس درخشندہ تعبیر سے کس قدر خوشی ہو گی!"

ہم اس میدان کے ولولہ انگیز ماحول میں پھر رہے تھے، اور جس مقام پر کوئی مہر العقول کارنامہ سامنے آتا تھا' ان مجاہدوں کے لئے' جن میں سے کچھ اُس وقت بھی ہمارے ساتھ ہی تھے' میرے لب پر بے ساختہ زمزمۂ تبریک و تہنیت آجاتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان افسر تھا۔ بڑا تیز اور ذہین۔ اس نے مجھ سے کچھ رازدارانہ انداز سے، آہستہ سے کہا کہ مجھے ایک بات بتائیے۔ آپ ہمارے ان کارناموں پر، قدم قدم پر ہماری تعریف و توصیف کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ غیب کی قوتوں نے کیا۔ ہمارا نشانہ ٹھکانے لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گولہ ہمارے توپچی نے نہیں پھینکا تھا۔ کسی سبز پیرہن بزرگ نے پھینکا تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دے کر دشمن کو پسپا کیا تو وہ ہم نے نہیں کیا، سفید گھوڑیوں پر سوار روحانی فوج نے کیا — جب یہ سب کچھ ان غیبی قوتوں نے کیا تو اس میں ہمارا (CREDIT) کیا ہے! میں نے دیکھا کہ اس کی اس تنقید میں طنز سے کہیں زیادہ ملال اور افسردگی کا پہلو نمایاں تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اُف! یہ افسانے (جنہیں خواہ بطور سازش پھیلایا گیا ہو یا بر بنائے جہالت) کس قدر حوصلہ شکن نتائج پیدا کر گئے ہیں۔ ہمارے وہ جانباز مجاہد جنہیں اپنے کارناموں پر فخر سے سر اٹھا کر چلنا چاہیئے تھا' ان افسانوں سے ان کے دل بجھ گئے ہیں۔ یہی وہ

خطرہ تھا جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام نے یہ کہا تھا کہ

ان حقیقتوں کو افسانے نہ بننے دیجئے

مجھے بتایا گیا کہ ان سپاہیوں نے یہ کچھ صرف اخبارات میں نہیں پڑھا - ہمارے جو بزرگ ان محاذوں کو دیکھنے آئے ہیں، انہوں نے بھی ان سے یہی کچھ کہا ہے - اور اس سے ان پر غیر شعوری طور پر بڑا حوصلہ شکن اثر ہوا ہے -

میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ عزیزم! ذرا اتنا سوچو کہ اگر یہ کارنامے ان غیبی قوتوں نے سرانجام دیئے ہیں تو پھر "نشانِ حیدر" میجر عزیز بھٹی (شہید) - اور "ہلالِ جرأت" ملک اختر کو کیوں دیا جا رہا ہے؟ نوجوان بڑا ذہین تھا - ایک ثانیہ میں بات کی تہ تک پہنچ گیا - اور کہنے لگا کہ "پھر قوم میں یہ (DUAL PERSONALITY) کیوں کارفرما ہے؟" میں نے کہا کہ اس کے متعلق، میں تفصیل سے، فرصت کے وقت بات کروں گا -

اور یہ فرصت مجھے اس وقت مل گئی جب ہم میس کے باہر، دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھے - اس مجلس میں، افیسرز بھی تھے اور جوان بھی - اس سے پہلے، فوجیوں کے اس قسم کے ریمارکس بھی مجھ تک پہنچ چکے تھے کہ ہم سترہ برس تک کا مل، اپنے اہلِ وطن کے طعن سنتے رہے - کوئی کہتا کہ یہ فوجی مفت میں بیٹھے قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر عیش اڑا رہے ہیں - کہیں سے آواز آتی کہ ان سے نہریں کھدوایئے - کوئی کہتا ان سے سڑکیں کٹوایئے - پچھلے دنوں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو ملک میں ایسے کہرام مچ گیا گویا فوج نے قوم کو لوٹ لیا ہے - ہم یہ سب کچھ سنتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے - اس لئے کہ جب تک کوئی معرکہ سامنے نہ آئے، فوج کیا بتا سکتی ہے اور کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے - خدا خدا کر کے یہ موقع ملا کہ ہم اپنی ہستی کا جواز، اور اپنے مقام کی اہمیت کا مظاہرہ کر سکیں - ہم نے ایسا کیا اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اہلِ ملک نے، جنگ کے دوران، اس کا دل کھول کر اعتراف کیا - لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی، یہ حکایتیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ یہ سب کچھ غیبی قوتوں کی وجہ سے ہوا ہے - فوج کا اس میں کیا ہے؟ اس سے ہم پھر اسی مقام پر آ گئے جہاں پہلے تھے -

میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا - اس لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ضروری خیال کیا کہ اس باب میں قرآنی حقیقت کو ان کے سامنے پیش کر دوں - چنانچہ میں نے ان سے تفصیل سے باتیں کیں جن کا انداز یہ تھا کہ:

"عزیزانِ من! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کے پروگرام، غیبی قوتوں سے نہیں، بلکہ انسانی ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں - قرآن کریم میں دیکھئے - جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی ہے وہاں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش اور مستبد لوگوں کی روک تھام

کے لئے، انسانوں کی جماعتیں، اٹھ کھڑی ہوں، تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے! آپ نے دیکھا کہ دنیا میں، مستبد قوتوں کی روک تھام کا انتظام، انسانی جماعتوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ اور دیکھئے! مکہ کے مظلوم اپنی حفاظت کے لئے خدا سے فریاد کرتے ہیں، اور خدا، مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کمزور و ناتوان مظلوم کس طرح بلک بلک کر ہم سے مدد مانگ رہے ہیں۔ تم ان کی امداد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ آپ نے دیکھا کہ خدا ان مظلوموں کی امداد کے لئے کوئی غیبی قوت نہیں بھیجتا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم ان کی مدافعت کے لئے اٹھو۔ یہی وہ مجاہد ہیں جن کے متعلق وہ (خدا) کہتا ہے کہ یہ لوگ خوف و ہراس کے حوصلہ شکن حالات میں نہایت پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑے رہتے ہیں اس لئے ہم ان پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتے ہیں (اولٰٓئِكَ عليهم صلوٰت من ربهم و رحمة)۔ اس کے برعکس، ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی سپاہی، میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان تمام مقامات میں آپ نے دیکھا کہ میدان جنگ میں فتح و کامرانی کا سبب، ان مجاہدین کے ثبات و استقامت اور جانبازی و سرفروشی کو قرار دیا جاتا ہے نہ کہ کسی غیبی قوت کو۔ اور اسی کے لئے انہیں اس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین سے کہا تھا کہ اگر تم میں بیس سپاہی بھی جم کر ثابت قدمی سے مقابلہ کریں گے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آ جائیں گے۔ اس میں دیکھئے کہ دشمن کے دو سو سپاہیوں کو مغلوب کرنے کے لئے بیس ثابت قدم مجاہدین کی ضرورت لاینفک قرار دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی مقابلہ کے لئے کھڑا نہیں ہوگا تو بھی دشمن کے (کم از کم) ایک سو ہی سپاہی ہماری غیبی قوتوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر ان بیس کے لئے استقامت اور ثبات کی شرط ضروری سمجھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساز و سامان کی موجودگی بھی۔ کیونکہ وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت پورے ساز و سامان کے ساتھ ہے۔ سردست، جب تم میں ساز و سامان کی مقابلتہً کمی ہے، تم اپنے سے دگنی تعداد پر بالضرور غالب آجاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بھی تاکید کر دی کہ تم اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے خوب مستحکم رکھو۔ (اس زمانے میں بہترین استحکام کا یہی ذریعہ تھا)۔ یہ نہیں کہا کہ تم میدانِ جنگ میں چلے جاؤ۔ تمہاری سرحدوں کی حفاظت غیبی قوتیں کریں گی۔ اس لئے یاد رکھئے! اس جنگ میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے، وہ آپ کی اور صرف آپ کی ہمتوں کا صدقہ ہے۔ اور اس کا سہرا صرف آپ کے سر ہے۔ اس میں کسی "سبز پیرہن یا سفید قبا" والے کا کوئی دخل نہیں۔ آپ قوم کے نزدیک بھی درخورِ صد تعریف و ستائش ہیں اور خدا کے ہاں بھی مستحق ہزار درجات و مناصب"

میں یہ کہہ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر سرخی دوڑتی جا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک

پیدا ہو رہی ہے اور ان کے سینوں میں تازہ ولولے بیدار ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ایک مجاہد نے (جو ذرا زیادہ عمر کا تھا) پوچھا کہ جس چیز کو تائید خداوندی کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کے متعلق بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر کام کے لئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نفع بخش اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ اسے تائید خداوندی کہتے ہیں۔ یہ قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک قانون تو یہ ہے کہ جب آپ توپ کا رخ ٹھیک کر کے صحیح زاویہ کے مطابق، عین وقت پر گولہ چلائیں گے تو وہ ٹھکانے پر لگے گا۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ اگر آپ عدل اور انصاف کی خاطر جنگ کریں گے۔ آپ کا مقصد مظلوموں کی امداد ہوگا۔ اور آپ جنگ میں بلند اخلاق کو پیش نظر رکھیں گے تو آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جائیں گی جن سے آپ کا ایک ایک سپاہی، دس دس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں "خدا کی راہ میں لڑنا" اس طرح لڑنے والوں کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی اللہ کا لشکر کہا ہے۔ اور اس جنگ کو "خدا کی مدد کرنا" قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ولن ینصر اللہ من ینصرہٗ (۲۲/۴۰)۔ "خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے گا"۔ یعنی جو لوگ ان مقاصد کی خاطر جنگ کریں گے جنہیں خدا نے اچھا قرار دیا ہے، اور جنگ میں ان امور سے مجتنب رہیں گے جن سے اس نے روکا ہے تو انہیں ایسی جمعیت خاطر اور اطمینانِ قلب نصیب ہوگا جس سے ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے زیادہ ہو جائیں گے اور خطرات کے مقابلہ کے وقت ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس کا نام تائید خداوندی ہے۔ لیکن یاد رکھئے۔ اگر آپ "توپ کے گولے والے" قانون میں ... غلطی یا سستی کر جائیں گے تو اس کا نقصان ہو کر رہیگا۔ "جنگ احد میں، نبی اکرمؐ سپہ سالار اعظم تھے اور صحابہؓ کبار سپاہ۔ یہ لشکر حق و صداقت کے لئے میدان میں نکلا تھا اس لئے انہیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جب ان کے ایک دستے نے ذرا سی غلطی کی تو ان کی فتح شکست میں بدل گئی۔ (اور تو اور) خود نبی اکرمؐ کو بھی زخم آئے۔ کسی غیبی قوت نے انہیں، اس غلطی کے نقصان سے نہیں بچایا۔ حق کی خاطر لڑنا اور توپ کا رخ صحیح رکھنا، اس سے جو خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں انہیں تائید خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کرنے کا بھی سارا (CREDIT) مجاہدین کو ملتا ہے۔ ان مجاہدین کو جن کے ہاتھوں خدا کے پروگرام تکمیل تک پہنچتے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ایک نوجوان نے کہا کہ روحانی قوت بالآخر ہوتی ہی ہے نا! میں نے کہا کہ ہاں ہوتی ہے، لیکن وہ

مجاہد کے دست و بازو میں ہوتی ہے۔ یہی وہ دست و بازو تھے جن کی حیرت انگیز قوت کو دیکھ کر خود خدا نے کہا تھا کہ "میدان جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ تم تلواروں کا وار نہیں کر رہے تھے ہم کر رہے تھے"۔ یاد رکھئے — ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — آپ نے غور نہیں کیا کہ خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والے گرد و غبار کی قسم کھائی ہے۔ ان کے نعلوں سے ابھرنے والی چنگاریوں کی قسم کھائی ہے۔ کسی "روحانی قوت" کے مدعی کے تسبیح و مصلّے کی قسم نہیں کھائی۔ اس لئے مجاہد کا مقام سب سے اونچا ہے۔ آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

ان قرآنی بصائر کا نتیجہ تھا کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہاں کی فضا بدل چکی تھی۔ یہاں پہنچنے کے بعد، مجھے خط موصول ہوا اس میں تحریر تھا کہ

اس رجمنٹ کے سب افسران اور جس جس جوان سے آپ ملے نہایت متاثر ہوئے۔ ان کا (MORALE) تابناک جا پہنچا۔ (دوبارہ) جنگ سے پہلے کہیں آپ سے دو چار باتیں سن لیں تو کم از کم اس یونٹ کے جوان بخوشی سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ فالحمد للہ۔

جنگ اُحد میں جب مسلمان مجاہدین کو اپنی ایک غلطی سے شکست ہوئی تو اس کا ان کے دل پر بُرا اثر ہوا۔ اس بد دلی کے ازالہ کے لئے قرآن کریم نے ان سے کہا کہ تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ اگر آج تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو اس سے پہلے اس قسم کا زخم تم فریق مخالف کو لگا چکے ہو۔ یہ جنگ کا میدان ہے۔ اس میں پلڑے جھکتے اور اٹھتے رہتے ہیں۔ اگر کسی وقت، کسی غلطی یا لغزش سے، وقتی طور پر شکست ہو جائے تو اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ دوسرے وقت میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

داہگہ کی سرحد پر اپنا کچھ نقصان دیکھ کر مجھ پر جو کچھ تھوڑی سی افسردگی طاری ہوئی تھی، اس کا ازالہ کھیم کرن کا محاذ دیکھنے سے ہو گیا۔ سیالکوٹ کے محاذ پر ہمارا کچھ علاقہ دشمن کے قبضہ میں آ گیا ہے۔ اس کا اثر زائل کرنے کے لئے مجھ سے کہا گیا کہ اب تم چھمب کا محاذ دیکھ آؤ۔ کھیم کرن میں اگر تمہیں "قَرْحٌ مِّثْلُهٗ" نظر آیا تھا۔

تو چھمب میں تمہیں قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْهَا (۳/۱۶۴) دکھائی دے گا۔ یعنی جس قدر نقصان دشمن نے تمہیں پہنچایا ہے۔ تم اس سے دگنا نقصان اسے پہنچا چکے ہو۔ اور اگر راجستھان کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے تو پھر دشمن کا نقصان ہم سے چار گنا ہو جاتا ہے۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر

چنانچہ ۲۲ دسمبر کی دوپہر ہم چھمب کے سیکٹر کی طرف روانہ ہوئے۔ رات جلالپور جٹاں میں گزاری۔ پروگرام تو یہی تھا کہ وہاں خاموشی سے رات گزار کر آگے چلے جائیں گے۔ لیکن شدہ شدہ قرآنی احباب کو اطلاع مل گئی۔ تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ اس طرح قرآن کی باتیں بھی ہو گئیں اور بہت سے قدیمی دوستوں سے ملاقات بھی۔ جن تعلقات کی بنیاد۔ پرخلوص قرآنی رشتہ پر ہو۔ انہیں جس بے لوث محبت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کی مثال کسی اور رشتے میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ مختصر سی محفل اسی جذبہ کی حسین یادگار رہی۔ اس پر ہمارے میزبانِ عزیز میر عبدالغنی صاحب اور محترم مرزا غلام حسین صاحب کا حسنِ تواضع — وجہ نشاط قلب و نظر تھا۔ اس پُرسرور فضا میں رات بسر ہوئی اور ۲۳ کی صبح ہم جانبِ منزل روانہ ہو گئے۔

جلال پور جٹاں سے قریب دس میل کے فاصلہ پر (بمقام ٹانڈہ) ہمارے فوجی راہنما مل گئے — ایک نہایت ذہین، پُرخلوص اور شگفتہ مزاج فوجی ڈاکٹر جن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس محاذ کی پوری جنگ میں وہ بذاتِ خود شریک تھے۔ اس لئے وہ راستہ بھر فوج بیتی نہیں بلکہ (یوں کہئے) کہ آپ بیتی سناتے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ فوجی معرکہ آرائی کا صحیح اندازہ ہو ہی اس وقت سکتا ہے۔ کہ میدانِ کارزار آپ اپنے قدموں سے ناپیں۔ اور حدی خواں وہ ہو جس نے اس معرکہ میں خود حصہ لیا ہو۔ ٹانڈہ سے تھوڑی دور آگے بڑھے تھے۔ کہ سڑک کے کنارے ایک طرف، سرخ حروف میں نوشتہ ایک کتبہ نظر آیا جس پر لکھا تھا

" LIBERATED AREA "

میری نگاہیں ان حروف پر تھیں۔ اور زبان پر ندائے آسمانی کی یہ نشید جانفزا کہ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا۔ (۳۳/۲۷) "اس نے تمہیں ان دشمنوں کی زمینوں کا، ان کی بستیوں کا، ان کے مال و دولت کا وارث بنا دیا۔ اور اس سرزمین کا بھی جس پر ہنوز تمہارے قدم نہیں پڑے تھے۔" ایک طرف یہ حیات آور احساس اور دوسری طرف اس کتبہ کے الفاظ کا حسنِ انتخاب۔ جو گزشتہ اٹھارہ سال کے ماجریات کی منہ بولتی تصویر تھے۔

میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

تھوڑی دور آگے چھمب کا ویران شدہ قصبہ تھا۔ جس کے تھانے میں ہماری پولیس تھی۔ اس تھانے کی تصاویر اس علاقہ کی فتح کے ساتھ، سب سے پہلے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ اب وہ خود ہمارے سامنے تھا۔ اندر گئے تو تھانے کے انچارج پولیس آفیسر نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ چائے کی پیشکش کی۔ لیکن آگے بڑھنے کی شدتِ اشتیاق نے معذرت خواہی پر مجبور کر دیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ یہاں سے جوڑیاں، جو ہمارے سفر کی آخری منزل تھی۔ بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن ہمارے عزیز راہنما نے بہ کمالِ شفقت کہا۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پورے راستے کو دیکھیں جس سے ہماری فوجیں گذر کر جوڑیاں پہنچی تھیں۔ تاکہ سارے محاذ کا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔ اور سفر کے بعد جا کر اس کا احساس ہوا۔ کہ یہ ہمارے اس رفیقِ محترم کا خلوص تھا جس کی وجہ سے انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا ـــ وہ راستہ جس کا طے کرنا ـــ لانا تھا جوئے شیر کا ـــ ورنہ اگر وہ ہمیں سیدھے جوڑیاں لے جاتے۔ تو ہم پھر بھی ان کے شکرگذار ہوتے۔ لیکن اسطرح ہم وہ کچھ کھو دیتے۔ جسے ہم شاید دوبارہ نہ پا سکتے۔

اس راستے کا اندازہ اس سے لگائیے۔ کہ ہم قریب ساٹھ میل کی مسافت طے کر کے جوڑیاں پہنچے تھے۔ اس تمام سفر میں بیشتر حصہ ایسا تھا جس میں سڑک تو ایک طرف نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ نشانِ راہ۔ سارا راستہ پہاڑی نالوں کے بڑے بڑے پتھروں سے پٹا پڑا تھا۔ جن پر سے جیپ گزرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے زلزلہ آ رہا ہے۔ پھر ان پتھروں میں سرو قد سرکنڈے کے "جنگل" ـــ واقعی جنگل جن میں چار قدم تک بھی نگاہ صاف نہیں جا سکتی تھی۔ یہ تھا ہماری فوجِ ظفر موج کا محاذِ جنگ ـــ تھوڑی دور آگے گئے تو بیرجمال کی سطحِ مرتفع پر دشمن کا پہلا مورچہ نظر آیا۔ مورچہ کیا تھا۔ ایک زمین دوز چھاؤنی تھی۔ لیکن اب اس کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔

راستہ کے پتھروں سے ٹکراتے اور سرکنڈے کے جنگل کو چیرتے، میلوں آگے گئے۔ تو سامنے کی پہاڑی پر، دشمن کے پختہ مورچوں کے باقیات دکھائی دیئے۔ اور نیچے ایک وسیع آبادی کی شکستہ سرنگوں عمارات، جن میں ادھر ادھر فوجی بکتر بند گاڑیوں کے ڈھانچے بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیوا کی چھاؤنی تھی۔ جو دشمن کا بٹالین ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس مقام پر ان سے سخت تصادم ہوا تھا۔

ان کھنڈرات میں، ایک طرف ایک چوکھنڈی کے اندر، ایک مزار تھا ـــ کم از کم پینتیس چالیس فٹ لمبا۔ اس کے سرہانے "پیر کالی شاہ" کندہ تھا اور چاروں طرف تازہ جلی ہوئی موم بتیوں کے باقیات اس حقیقت کے غماز کہ یہ خانقاہ اب مرجعِ انام بن رہی ہے ـــ اس قسم کی گولہ باری میں اس کا محفوظ رہ جانا ـــ مدفون پیر صاحب کی کرامت کی زندہ شہادت بن جانے کے لئے کافی تھا ـــ اصل یہ ہے کہ دنیا میں توہم پرستی کے خلاف اتنی

قسم کے اتفاقی حادثات ہوتے ہیں۔ اور پھر مرورِ زمانہ سے یہی اتفاقات اوران سے منسلک خود تراشیدہ افسانے کرامات بن جاتے ہیں۔

یہاں سے آگے بڑھے۔ تو دریائے توی کے کنارے منڈیالہ کراسنگ پر پہنچے۔ اس مقام پر بھارتی ایک بہت بڑا پُل بنا رہے تھے۔ اس کی بنیادوں کے ستون ہمارے سامنے کھڑے تھے اور تعمیر کا باقی سامان کنارے پر پڑا ہر راہ رو سے کہہ رہا تھا۔ کہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

دریائے توی یوں تو ایک پہاڑی نالہ ہے۔ لیکن اس کا خنک پاٹ بتا رہا تھا۔ کہ برسات کے دنوں یہ ایک سیلِ بے پناہ بن جاتا ہوگا۔ ہمارے جیوش خدامت نے اسے ستمبر کے شروع میں عبور کیا تھا۔ اسے پار کیا تو سامنے وہ سڑک (پہاڑی راستہ کہئے) تھی۔ جو جوڑیاں کی طرف جا رہی تھی۔ چند میل آگے بڑھے تو دور سے پہاڑی کے اوپر ایک قدیم قلعہ نظر آیا۔ اسے قلعہ کلیت کہتے ہیں۔ دروازے پر لفٹننٹ کرنل شیو رام سنگھ (مارچ ۱۹۳۳ء) لکھا تھا — مارچ ۱۹۳۳ء کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کیونکہ قلعہ کی عمارت تو سینکڑوں برس پرانی دکھائی دیتی تھی۔ قلعہ کے اوپر چڑھے تو اس کے محلِ وقوع کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس وقت مطلع ابر آلود تھا۔ ورنہ (کہتے تھے۔ کہ) وہاں سے گجرات، سیالکوٹ، جموں تک کی آبادیاں نظر آجاتی تھیں۔ اب بھی ہمارے سامنے بیسیوں میل کا علاقہ تھا۔ قلعہ کی پوزیشن ایسی تھی کہ اس پر اگر ایک سپاہی مشین گن لے کر کھڑا ہو جائے، تو نیچے کتنی ہی فوج ہو۔ کسی کو قریب تک نہ آنے دے۔ لیکن ہمارے عساکر کے سیلِ رواں کے سامنے یہ قلعہ بھی ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط ثابت نہ ہوا — یقینِ محکم اور عزمِ راسخ دنیا میں کیا کچھ کر دکھاتا ہے۔!

اس سے ذرا آگے بڑھے۔ تو سامنے جوڑیاں کا ویران شدہ قصبہ تھا۔ جس کے ڈاک بنگلہ میں اب ہمارا فوجی ہیڈکوارٹر تھا۔ لیکن جوڑیاں تک پہنچنے سے پہلے ذرا رکئے۔ اور دیکھئے کہ وہ سامنے کیا نظر آتا ہے؟ یہ ٹروٹی کی پہاڑی ہے جس پر یہاں سے وہاں تک چاروں طرف تین تین منزل کے پختہ مورچے تھے۔ یہ مورچے دشمن کا قلعہ تھے۔ جس کے دامن میں جوڑیاں کا قصبہ تھا۔ اس پہاڑی کے نیچے سے گذر کر جوڑیاں کو فتح کرنا۔ اور پھر اس سے آگے اکھنور تک جا پہنچنا — کم از کم ہمارے ذہن میں تو نہیں آسکتا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا ہم اس ورطۂ حیرت میں گم تھے کہ ہماری جیپ ڈاک بنگلہ کے احاطہ میں جا پہنچی۔ وہیں افسیرز میس تھا۔ ہم نے جہاں بھی اپنے جیالے نوجوانوں کو دیکھا — وہ افسر تھے یا جوان — انہیں ہر جگہ شگفتہ و شاداب پایا۔ مجھے کہیں کسی ایک جگہ بھی کوئی ایسا فوجی نظر نہیں آیا۔ جو افسردہ یا تنگ مزاج ہو اُن دن اور لندن بی بی سی کا

ایک نمائندہ بھی بغرضِ سیاحت وہاں آیا ہوا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے ساتھ گفتگو میں گذرا۔ خوراک کے مسئلہ پر بھارت کے واویلے کا ذکر آیا۔ تو ایک افسر نے کہا کہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ جب ہم نے اس مقام (جوڑیاں) پر قبضہ کیا ہے۔ تو یہاں شہری گوداموں کے اندر اس قدر فاضل غلہ بھرا پڑا تھا۔ جو ان سے دو تین سال تک بھی ختم نہ ہوتا۔ (یہی کچھ ہم نے کھیم کرن میں سنا تھا) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بھارت کی چیخ و پکار کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔ شہری آبادی کا ذکر آیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے قبضہ کرنے سے پہلے یہ قصبہ خالی ہو چکا تھا۔ البتہ یہاں تیس چالیس بوڑھے بوڑھے مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ یعنی ان کے عزیز رشتہ دار خود تو جان بچا کر بھاگ گئے۔ اور اپنے ان سن رسیدہ بزرگوں کو پیچھے دشمن کے حوالے کر گئے — بعینہٖ یہی کچھ ہم نے کھیم کرن میں سنا تھا۔ اس سے آپ ہندو قوم کی ذہنیت کا اندازہ لگائیے۔ عقیدہ ان کا یہ ہے۔ کہ مہاراج رام چندر نے اپنے پتا کے بچن کا پالن کیا۔ (یعنے اپنے والد کے دیئے ہوئے قول کو نبھایا۔) تو وہ ایشور کے اوتار ہو گئے۔ اور عمل ان کا یہ کہ بھاگتے وقت اپنے بوڑھے والدین کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ماں باپ تو ایک طرف ان کی حالت یہ ہے کہ یہ گائے کو ماتا کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے۔ لیکن اس ماتا کے ساتھ ان کا سلوک یہ ہوتا ہے۔ کہ (ہم ہندوستان میں دیکھا کرتے تھے کہ) جب تک وہ دودھ دیتی اسے پاس رکھتے۔ لیکن جونہی وہ بوڑھی ہو جاتی اسے یا تو دوسروں کی نظر بچا کر قصابوں کے ہاتھ بیچ دیتے۔ اور یا گھر سے باہر نکال کر آوارہ چھوڑ دیتے — جو قوم اپنے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ وہ عام انسانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کریگی۔ ظاہر ہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد، ہم جوڑیاں کے اجڑے ہوئے قصبہ کو دیکھنے گئے۔ قصبہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن برباد شدہ عمارات کے کھنڈرات بتا رہے تھے۔ کہ یہاں کے رہنے والے اچھے خوشحال ہوں گے۔ لیکن کھیم کرن کی طرح یہ قصبہ بھی وجعلنٰھم احادیث کا عبرت انگیز مرقع تھا۔ یعنی ان بستیوں کی اب صرف داستانیں باقی رہ گئی تھیں۔ دور سے سڑک کے کنارے وہ مسجد[1] دکھائی دی جس کی بابت اخبارات میں اکثر پڑھا تھا۔ بتایا گیا ..... کہ یہ بڑی خستہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اب ہمارے مجاہدین کے حسنِ عقیدت اور جوشِ عمل نے اسے اب بڑی پاکیزہ عمارت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس مقام سے آگے قریب چار میل تک ہمارا قبضہ ہے لیکن فائر بندی کے سلسلہ میں ہندو جس انداز سے معاہدہ کا "احترام" کر رہا ہے اس کے پیش نظر — اب سیاحوں کو آگے نہیں جانے دیا جاتا۔ ہمارے زیر قبضہ علاقہ سے آگے قریب تین میل سامنے اکھنور کا مشہور

---

[1] یہ وہی مسجد تھی جس کے متعلق ہندوستان نے شور مچایا تھا کہ پاکستانی افواج نے صبح آٹھ بجے بمباری کی اور مسجد میں نمازیوں کو ہلاک کر دیا۔ اول تو آٹھ بجے دن کے کوئی نماز ہی مسجد میں نہیں ہوتی۔ اور پھر اس مسجد میں تو موچی بیٹھتا اور جوتے گانٹھا کرتا تھا۔

قصبہ ہے۔ یہاں ہم نے اپنے جاں فروش سپاہیوں سے اکھنور کے معرکہ کے تفصیلی حالات سنے۔ انہیں اکھنور سے ادھر رک جانے کا اس قدر افسوس تھا۔ کہ میں نے دیکھا۔ کہ اس کا ذکر آتے ہی وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے۔ لیکن جس بے تابانہ نظر سے وہ اکھنور کی سمت دیکھتے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک بندھے ہوئے شیر کی طرح اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ اگر ایک دفعہ فائر بندی کی آہنی زنجیر کھول دی جائے تو یہ جموں سے ورے دم ہی نہ لیں۔ وہ یہ سننے کے لئے مضطرب و بیتاب نظر آتے تھے کہ فائر بندی کے احکام کب واپس لئے جائیں گے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ؎ سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ اس لئے ہمیں واپس آنا پڑا۔ اگرچہ جی نہیں چاہتا تھا۔ واپسی اس راستے سے ہوئی۔ جو سیدھا چھمب تک جا پہنچتا ہے۔ صاف، سیدھا، ہموار راستہ — نہ کہیں ٹیلے نہ پتھر۔ نہ ندی نالے نہ سرکنڈا۔ سارا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب۔ وادیٔ کشمیر میں جو کچھ نورجہاں کے دستِ حنائی اور جہانگیر کے ذوقِ رعنائی نے کیا ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو شادابی اور دلکشی میں یہ علاقہ اس سے کم نہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے اس سے بھی زیادہ جاذب کہ یہاں ہر طرف آموں کے پیڑ ہیں۔ جو وادی میں نہیں ملتے۔ آم تو اس سارے علاقہ میں بڑی افراط سے پھیلا ہوا ہے۔ راستے میں کھوڑ اور پلاں والا کی چھاؤنیوں کی تباہ شدہ عمارتیں دیکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اٹھارہ سال سے مسلسل جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ اس حسین و شاداب علاقہ کی لطف اندوزی سے ابھی دامنِ نگاہ پُر بھی نہیں ہوا تھا۔ کہ ہم دریائے توی پار کر کے۔ چھمب کے تھانے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں ذرا رکئے اور دو اہم نکات پر نگہ بازگشت ڈالئے۔

ایک تو یہ کہ اس سیدھے راستے سے ہماری فوجیں گھنٹہ بھر میں جوڑیاں تک پہنچ سکتی تھیں۔ انہوں نے اس راستے کو چھوڑ کر وہ راستہ کیوں اختیار کیا جس کی دشوار گزاریاں اس قدر ہمت طلب اور حوصلہ شکن تھیں۔ یہ اس لئے کہ اس طرف سے آتے ہوئے اس بین الاقوامی حد فاصل (باؤنڈری لائن) کو توڑنا پڑتا تھا۔ جسے قائم رکھنے کا پاکستان عہد کر چکا تھا۔ دوسری طرف آزاد کشمیر کا علاقہ تھا جس میں اس قسم کی کوئی پابندی ہم پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ آزاد کشمیر کی افواج ادھر سے بڑھ رہی تھیں۔ اور ہم ان کی مدد کے لئے پہنچے تھے۔ اس سے آپ

لے یہ رک جانا اسلئے تھا۔ کہ لاہور کی حفاظت کا تقاضا تھا۔ کہ وہاں کی فوجوں کو فی الفور اس طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر یہ فوری ضرورت لاحق نہ ہوتی تو اس وقت نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اس سے اندازہ لگائیے۔ کہ لاہور کی حفاظت کے لئے ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ موقعہ آنے پر اہل لاہور اس قرض کو حسن و خوبی ادا کر دینگے۔ یہ احسان فراموش نہیں ہیں۔

اندازہ لگایئے۔ کہ پاکستان بین الاقوامی معاہدات کا احترام کس طرح کرتا ہے۔ وہ ہمارے علاقے کے اندر اعوان شریف کے گاؤں پر بمباری کرچکا تھا۔ اب کون سا امر مانع تھا کہ ہماری افواج سیدھی ان کے علاقہ میں نہ چلی جاتیں لیکن ہم نے اس پر بھی ایسا نہیں ۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی طرف سے معاہدات کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اور دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے۔ کہ اس محاذ پر ہماری فوجوں نے جو محیر العقول کارنامے کرکے دکھائے اس کی مثال بھی تاریخ میں شاید ہی کہیں اور ملے۔ چھمب سے لیکر جوڑیاں تک ہم نے ہر مقام پر دیکھا کہ دشمن کے مورچے پہاڑیوں اور بلند ٹیلوں پر تھے ۔ اور ہماری فوجیں نشیب کی طرف سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جو شخص فنونِ جنگ سے کچھ بھی واقف نہ ہو۔ وہ بھی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے۔ کہ ان حالات میں مقابلہ کس قدر مشکل، اور معرکہ کس قدر جرأت آزما تھا۔ لیکن ہماری فوجوں کو کسی ایک مقام پر بھی شکست نہیں ہوئی۔ وہ درانہ آگے بڑھتی گئیں اور دشمن بھیڑ بکریوں کی طرح ان سے آگے آگے انتہائی بدحواسی کے عالم میں بھاگتا چلا گیا۔ اکثر مقامات پر اس طرح کہ توپ میں گولہ ڈالا ہوا ہے لیکن اسے توپ داغنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ یا اس کا ہوش نہیں رہا ۔ اور وہ اسے ویسے کا ویسا چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔ دیوا کا پہاڑی مورچہ، منڈیالہ کراسنگ کا حصن حصین، کلیٹ کا سر بفلک قلعہ، تروٹی کی پہاڑیوں کے تین تین منزلہ پختہ مورچے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک بار پھر وہ معرکۂ کہن تازہ ہو گیا۔ جس کے ضمن میں قرآن نے کہا تھا۔ کہ قذف فی قلوبہم الرعب (اس نے دشمن کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا) جو گروہ موت کے ڈر سے بے خوف ہو کر آگے بڑھے گا اس کی ہیبت سے پہاڑوں کے دل دہل جائینگے۔ اسی کا مظاہرہ اس محاذ پر ہؤا۔ اور یہ سب کچھ تین چار دن کے اندر ہو گیا۔ حالانکہ ایسا طویل اور فرہاد طلب راستہ اتنے عرصہ میں بحالتِ اطمینان بھی بمشکل پیدل طے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محاذ کو دیکھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ کہ ہرچند ساز و یراق اور شمشیر و سناں بھی جنگ کے لئے لابدی ہے۔ لیکن فیصلہ کن ہاتھ ان انسانوں ہی کا ہوتا ہے جو اس سامان اور اسلحہ کو استعمال کرتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں وہ انسان (فوجی سپاہی) موجود ہیں جن کا مقابلہ شاید ہی دنیا کا کوئی اور سپاہی کر سکے۔ پاکستانی افواج کے شیر دل مجاہدو! قوم کو آپ پر بجا طور پر ناز ہے۔ تم زندہ و سلامت ہو تو پاکستان ہر خطرہ سے محفوظ و مامون ہے۔ اللہ تمہیں زندہ و سلامت رکھے۔ تم جہاں بھی ہو — دس کروڑ انسانوں کی حسین تمنائیں اور تابندہ آرزوئیں تمہارے ہمرکاب ہیں!

دیدہ بینائے قوم علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ — "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی" ان محاذوں کو دیکھ کر یہ دعویٰ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ 'نم' قرآنی اقدار کے پاک اور صاف زندگی بخش چشمہ کے سوا اور کہاں سے مل سکتا ہے۔ خدا ہمیں اس چشمۂ حیات سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کی سعادت نصیب کرے۔ والسلام!

بچوں کا صفحہ

تمہیں نیا سال مبارک ہو!

سال کا پہلا دن ہفتے کا ہی ایک دن اور مہینے کی ہی ایک تاریخ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ عام دنوں اور عام تاریخوں سے مختلف ہوتا ہے۔ تمہیں کتنی فکر ہوتی ہے کہ یکم جنوری سے پہلے تمہارے کمرے کی دیوار پر نیا کیلنڈر لگ جائے اور تم نئی ڈائری حاصل کرلو۔ اس سلسلہ میں بڑا تردّد اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کو نئے سال کی مبارک باد بھی دی جاتی ہے۔ مگر کیلنڈر اور ڈائری سے زیادہ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ تم اپنی زندگی کی کتاب کا ایک نیا ورق الٹتے ہو۔ تم ایک سال اور جوان اور اپنے بچپن سے ایک سال اور دُور ہوجاتے ہو۔ عمر کا موٹا حساب سن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ مثلاً یکم جنوری ۱۹۶۵ء کو پیدا ہونے والا بھی اور اسی سال ۳۱ر دسمبر کو پیدا ہونے والا بھی اپنی عمر کا حساب لگاتے ہوئے یہی کہتا ہے "میں ۱۹۶۵ء میں پیدا ہوا تھا۔"

موٹر پر سفر کرتے ہوئے تم دیکھتے ہو کہ سڑک کے کنارے پتھر لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے کہ اس جگہ سے لاہور اتنے میل ہے، پشاور اتنے میل ہے۔ اس کو "سنگِ میل" کہتے ہیں، یعنی وہ پتھر جس سے ہم کو یہ پتہ چلتا ہے کہ آگے آنے والے شہر کتنے میل رہ گئے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے شہر کتنے دُور ہوگئے ہیں۔

یوں سمجھو کہ یہ سال اور سنہ بھی ہماری زندگیوں میں سنگِ میل ہوتے ہیں۔ زندگی کے سفر کے یہ وقفے ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس وقفے کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا صحیح استعمال یہ ہے کہ ہم کچھ سوچنے کا کام کریں —— جو سال ختم ہورہا ہے اس میں

ہم نے کیا کیا کام کئے ہیں۔ کرنے کے کون کون سے ایسے کام تھے جو ہم نہیں کر سکے۔ ہم سے کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ہم کتنے انسانوں کے کام آئے۔ ہم نے کتنے لوگوں کا دل دکھایا۔ زندگی میں جو پروگرام ہم نے اپنے پیش نظر رکھے ہوئے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے ہم نے کیا کچھ کیا ہے اور اس سلسلہ میں کون سی کوتاہی ہم سے ہو گئی ہے — یہ سوچنے کا ایک کام ہے۔ سوچنے کا دوسرا کام یہ ہے کہ نئے سال میں ہم کیا کام کریں گے۔ پچھلے سال کی غلطیوں کی تلافی کس طرح کریں گے۔ کتنے اور لوگوں کے ہم کام آئیں گے۔ اپنے زندگی کے پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کتنی اور توجہ کتنا اور وقت دیں گے۔

انسان، انسان ہوتا ہے، مشین نہیں ہوتی۔ مشین کو ایک انداز سے چلا دیا جائے تو وہ ایک لگے بندھے طریقے سے چلتی جائیگی۔ مگر انسان کے لئے ایک ہی لگے بندھے طریقے پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے جو بچے ٹائم ٹیبل بنا کر کام کرتے ہیں انہیں بعض اوقات مایوسی اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مثلاً تم نے شام چار بجے کا وقت پڑھنے کے لئے رکھا ہے مگر کسی دن اس وقت کوئی مہمان آجاتا ہے۔ تمہارے ابا جی یا بھائی جان گھر نہیں ہوتے اور مہمان کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات تمہی کو کرنی پڑتی ہے۔ یا اگر تم مہمان کے پاس نہیں بیٹھتے تو تمہیں مہمان کی خاطر مدارات کے لئے کوئی چیز لانے کی غرض سے بازار بھیج دیا جاتا ہے۔ مہمانوں کی دیکھ بھال کرنا اور بازار سے سودا سلف لانا بھی تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ لہذا تم اپنے چار بجے کے مقررہ وقت پر پڑھ نہیں سکو گے۔ لیکن تمہیں اس نہ پڑھ سکنے پر افسوس نہیں کرنا چاہئے۔ تم اس کمی کو بعد میں پورا کر سکتے ہو۔

تم پوچھو گے "تو پھر کیا ہم ٹائم ٹیبل نہ بنایا کریں؟" نہیں! ٹائم ٹیبل ضرور بناؤ۔ لیکن اصل چیز ضابطے کی پابندی ہے، نہ کہ ٹائم ٹیبل کی۔ ضابطہ یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کو بالکل بے لگام نہ چھوڑ دو۔ اس میں ایک قاعدہ، ایک سلیقہ، ایک قرینہ ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ کھیلنا شروع کرو اور کھیلتے ہی رہو، اس خیال سے کہ اگلے روز زیادہ پڑھ لیں گے۔ یا جیومیٹری کا کام لے بیٹھو اور دوسرے مضمون رہ ہی جائیں۔ ہم جولیوں کے ساتھ گپیں ہانکنی شروع کرو اور گھنٹوں تک گپیں ہی چلتی رہیں۔ ہر کام — پڑھائی، کھیل، تفریح، سیر، عام مطالعہ — میں ایک تناسب، ایک توازن رکھو۔

اگر ۱۹۶۵ء میں تمہاری زندگی اسطرح

کے ضابطے کی پابند نہیں تھی تو کوشش کرو کہ ۱۹۶۶ء میں تم ضابطے کے پابند ہوجاؤ۔ اگر تم یہ پابندی سو فیصد نہ کرسکو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر پچھلے سال کے مقابلہ میں تم نے پانچ فی صد بھی زیادہ پابندی کرلی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ ویسے تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ یہ پابندی پچھلے سال کے مقابلہ میں کم از کم پچاس ساٹھ فی صد زیادہ ہو۔ تم کہوگے "یہ ترقی سو فی صد کیوں نہ ہو؟" ہونی تو سو فی صد چاہیئے مگر سو فی صد مشکل ہوتی ہے۔ تم دس قدم آگے چلو اور پھر پانچ قدم پیچھے آجاؤ — اس سے بہتر یہ ہے کہ تم ایک قدم آگے بڑھو اور پھر تمہارا یہ قدم واپس نہ آنے پائے۔

نیا سال شروع ہونے وقت جب تم گذرے ہوئے سال کا جائزہ لینے لگو تو یہ دیکھو کہ تم سے کہاں کہاں کمی رہ گئی ہے۔ اس کمی کا پتہ لگالینے کے بعد پچھتانا نہ شروع کردینا۔ یہ پچھتانے والی عادت بُری ہوتی ہے۔ پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پچھلی غلطی کی تلافی صرف اس طریقے سے ہوسکتی ہے کہ آیندہ اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ اگر دسمبر ٹیسٹ میں تم فیل ہوگئے ہو یا تم نے نمبر کم لئے ہیں تو اس پر پچھتانے سے یہ نتیجہ بدل نہیں سکتا۔ آج سے تہیہ کرلو کہ تم اگلے امتحان کے لئے (اور یہ تو تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سالانہ امتحان ہوگا) جی لگاکر کام کروگے۔ اگر دسمبر تک تم روزانہ دو گھنٹے تک پڑھا کرتے تھے تو اب روزانہ چار گھنٹے پڑھو۔ ایک تو سالانہ امتحان نزدیک آگیا ہے، دوسرے سردیوں کے موسم میں تم رات کو بھی دیر تک پڑھ سکتے ہو۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تم نے اپنے کسی دوست، کسی عزیز، کسی ہم جولی کا دل دکھایا ہے تو اس پر پچھتانے کی بجائے، نئے سال کے آغاز پر پہل کرکے اس کے گھر چلے جاؤ اور نئے سال کی مبارکباد دینے کے بعد اس سے صاف صاف لفظوں میں معافی مانگ لو۔ اگر اب تک تم نے زیادہ وقت کھیل کود میں، سیر سپاٹے میں، بے کار بیٹھے رہنے یا سوئے رہنے میں، تاش کھیلنے میں ضائع کیا ہے تو نئے سال سے ان چیزوں میں زیادہ وقت نہ صرف کرو۔

نیند اور آرام کے سلسلہ میں ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ بعض بچے نیند کے متعلق عجیب و غریب فلسفے رکھتے ہیں۔ اسی طرح آرام کے متعلق ان کے خیالات ہیں۔ آرام بھی ضروری ہے اور نیند بھی۔ ہم آرام اور نیند کے بعد تازہ دم ہوجاتے ہیں۔ پچھلی تھکن دُور ہوجاتی ہے اور ہم مزید کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ لیکن آرام اور نیند کے بارے میں اپنے فلسفوں کے ساتھ عقلمندوں کی یہ بات بھی پلّے باندھ لو کہ

آرام ان لوگوں کا حق ہے جو کام کرتے ہیں۔ جو آرام کام کرنے کے بعد کیا جائے اس سے جو سکون ملتا ہے وہ اُس آرام سے حاصل نہیں ہو سکتا جو کام کئے بغیر کیا جائے۔ رات کو تم اپنے سکول کا کام ختم کر کے سوؤ تو تم اطمینان کی نیند سو سکو گے۔ لیکن اگر کام ادھورا رہ گیا ہو تو اس سے تمہاری نیند خراب رہے گی۔ یہ احساس تمہیں چین سے سونے نہیں دے گا کہ تم نے اپنا آج کا کام مکمل نہیں کیا۔ اس طرح کی کیفیت میں تم آٹھ گھنٹے نیند کرو یا دس گھنٹے، صبح اٹھتے ہوئے تم طبیعت کو بوجھل پاؤ گے۔ اپنا کام مکمل کر کے سوؤ تو چار چھ گھنٹے کی نیند کے بعد بھی تم ایک تازگی اور شگفتگی محسوس کرو گے۔ نیند کے سلسلہ میں یہ فکر نہ کرو کہ وہ کتنے گھنٹے ہونی چاہیے۔ اسی طرح دن کے آرام کے سلسلہ میں بھی یہ کرو کہ اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر اس طرح آرام کرسی یا چارپائی پر لیٹو کہ جسم کے کسی حصے پر کوئی بوجھ، کوئی تناؤ محسوس نہ کرو۔ دماغ کو گہری سوچ یا فکر تشویش سے پاک رکھو۔ اس طرح آدھ گھنٹے میں تم جو فرحت محسوس کرو گے وہ کئی گھنٹے کے آرام سے محسوس نہیں کر سکو گے۔

آرام اور نیند کی کمی بیشی کوئی ایسی پریشانی والی بات نہیں ہوتی۔ آرام اور نیند دونوں ضروری ہیں مگر لیٹنے یا سونے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ تم نے آج کا کام پورا کر لیا ہے۔ اور یہ بات پھر ذہن نشین کر لو کہ آرام اور نیند ان کا حق ہے جو کام کرتے ہیں۔

——— (یونس بھائی جان)

لمعات (۱۰ سے آگے)

آنے والوں پر پڑے گی۔ اور جانے والوں کو خراج تحسین پیش کر کے آنے والوں سے انتقام لیا جائے گا۔ اور جب تک انہیں حکومت اور اقتدار میں حصہ نہیں ملتا یہ انوکھی روش جاری رہے گی۔

یہ ہیں اسلامی نظام اور اقامت دین کے وہ علمبردار جن کی زبانوں پر رات دن خدا، رسول اور اسلام کا نعرہ ہے۔ اور روش و کردار وہ ہے جس کی تفصیل سطور بالا میں سامنے آ چکی ہے۔ یہ لوگ یہاں جس قسم کا اسلام رائج کریں گے اس کا اندازہ اس روش سے لگایا جا سکے گا۔ تحریک پاکستان کے دوران بھی ان کی زبانوں پر "ہائے قیادت۔ وائے قیادت" کی نوحہ خوانی تھی اور آج بھی ان کے سینوں میں اسی ہوسِ قیادت کے جذبات پل رہے ہیں۔

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی پبلشر سراج الحق۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور مطبع۔ اشرف پریس۔ ۷ ایبک روڈ۔ لاہور۔

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیب ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من ویزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام / ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد (پانچ روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔

عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے میں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات و مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ - آٹھ روپے) سستا ایڈیشن - چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی - گلبرگ — لاہور